**اس شمارے میں**


| | | |
|---|---|---|
| اس شمارے میں | شاہد رضا | ۴ |
| **قرآنیات** | | |
| سورۂ یونس (۳) | جاوید احمد غامدی | ۶ |
| **معارف نبوی** | | |
| صدقہ کے بارے میں ترغیب | امین احسن اصلاحی | ۱۱ |
| **مقالات** | | |
| معاشرہ کی اصلاح کے وسائل | امین احسن اصلاحی | ۱۸ |
| **سیر و سوانح** | | |
| حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ | محمد وسیم اختر مفتی | ۲۲ |
| **نقد و نظر** | | |
| قوّامیت کے وجوہ | رضوان اللہ | ۳۲ |
| **نقطۂ نظر** | | |
| جزا کا خدائی قانون | محمد حسن الیاس | ۴۱ |
| **یسئلون** | | |
| جزا و سزا اتمام حجت کے ساتھ ہے | امین احسن اصلاحی | ۴۵ |
| **وفیات** | | |
| مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی | امین احسن اصلاحی | ۴۹ |


www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شاہد رضا

''قرآنیات'' میں حسب سابق جناب جاوید احمد غامدی کا ترجمۂ قرآن ''البیان'' شائع کیا گیا ہے۔ اس میں سورۂ یونس (۱۰) کی آیات ۲۰-۲۷ کا ترجمہ اور حواشی شامل ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ نے کفار کے مطالبۂ عذاب کے جواب میں فرمایا ہے کہ کفار کو نشانی دکھانے سے کوئی حاصل نہیں۔ پھر کفار کو فرمایا کہ آج تمھارے حالات درست ہیں تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم گرفت سے باہر ہو۔

''معارف نبوی'' میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''صدقہ کے بارے میں ترغیب'' شائع کیا گیا ہے۔ یہ موطا امام مالک کی چند روایات پر مشتمل ہے۔ ان کا موقف ہے کہ صدقہ میں جو چیز بھی ہو، اس میں خلوص ہونا چاہیے۔ زکوٰۃ و صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں۔ حکومت زکوٰۃ کے مال سے اجتماعی بہبود اور رفاہیت کے کام کر سکتی ہے۔

''مقالات'' میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''معاشرہ کی اصلاح کے وسائل'' شامل کیا گیا ہے۔ انھوں نے تجویز کیا ہے کہ معاشرے کے ذہین طبقہ پر جو مغربی فکر و فلسفہ مسلط ہے، اس کا مداوا صالح عقلیت سے کیا جائے اور اصحاب وسائل و ذرائع متحد ہو کر اسلام اور عام معاشرہ کی دینی و اخلاقی خدمت کریں۔

''سیر و سوانح'' میں جناب محمد وسیم اختر مفتی صاحب کا مضمون ''حضرت عبداللہ بن جحش رضی اللہ عنہ'' شائع کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے ان کے متعدد فضائل کے علاوہ واقعۂ ہجرت حبشہ و مدینہ، جنگ بدر و احد، سریۂ عبداللہ بن جحش، تمام غزوات میں کردار اور ان کی روایت حدیث کو بیان کیا ہے۔

''نقد و نظر'' میں جناب رضوان اللہ صاحب کا مضمون ''قوّامیت کے وجوہ'' شامل اشاعت ہے۔ اس میں انھوں نے آیت 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ' سے استدلال کرتے ہوئے کہا ہے کہ آیت کے دونوں فقرے مرد کی قوامیت کے وجوہ بیان کرنے کے لیے آئے ہیں۔

''نقطۂ نظر'' میں جناب محمد حسن الیاس کا مضمون ''جزا کا خدائی قانون'' شائع کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے جزا

کے بارے میں جوابات کی تنقیح پیش کی ہے۔

''یسئلون''میں سوال و جواب کی صورت میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''جزا و سزا اتمام حجت کے ساتھ ہے'' شامل اشاعت کیا گیا ہے۔ انھوں نے بیان کیا ہے کہ دوزخ میں صرف وہی لوگ جائیں گے جن پر اتمام حجت ہو چکا ہے۔ اس اتمام حجت کی شہادت ان کے خلاف دوسرے لوگ نہیں، بلکہ وہ خود دیں گے۔

''وفیات''میں مولانا امین احسن اصلاحی کا مضمون ''مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی'' شائع کیا گیا ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کے ہاں جو ان کی اہمیت تھی، اس مضمون میں مولانا نے اس کو اجاگر کیا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورۃ یونس

(۳)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.org
www.almawrid.com

وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا اِنِّيْ
مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾ وَاِذَآ اَذَقْنَا النَّاسَ رَحْمَةً مِّنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ
اِذَا لَهُمْ مَّكْرٌ فِيْٓ اٰيَاتِنَا قُلِ اللّٰهُ اَسْرَعُ مَكْرًا اِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُوْنَ مَا تَمْكُرُوْنَ ﴿۲۱﴾

---

اور یہ جو کہتے ہیں کہ نبی پر اُس کے پروردگار کی طرف سے کوئی نشانی[۲۸] کیوں نہیں اتاری گئی تو (اِن سے) کہو، (یہ غیب کے معاملات ہیں[۲۹] اور) غیب کا علم تو اللہ ہی کو ہے۔ سو انتظار کرو، میں بھی تمھارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں[۳۰]۔ (لوگوں کا حال یہ ہے کہ عذاب کی نشانی مانگتے ہیں، مگر) جب کسی تکلیف کے بعد جو اُنھیں پہنچی ہو ہم اُن کو اپنی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو ہماری نشانیوں کے معاملے میں حیلے

---

۲۸؎ اصل میں لفظ 'اٰیَۃٌ' آیا ہے۔ آگے کی آیات سے واضح ہے کہ اِس سے یہاں عذاب کی نشانی مراد ہے جسے دیکھ کر واضح ہو جائے کہ پیغمبر جس فیصلہ کن عذاب کی وعید سنا رہا ہے، وہ بھی آ کر رہے گا۔

۲۹؎ یعنی یہ معاملات کہ اللہ عذاب کی کوئی نشانی دکھائے یا کسی قوم پر وہ عذاب نازل کرے جس کی وعید سنائی جا رہی ہے۔

۳۰؎ یہ قوم کو مبتلاے عذاب دیکھنے کی تمنا نہیں، بلکہ حسرت و اندوہ کے ساتھ ایک ایسی چیز کا انتظار ہے جو قوم کی

هُوَ الَّذِیْ یُسَیِّرُکُمْ فِی الْبَرِّ وَالْبَحْرِ حَتّٰٓی اِذَا کُنْتُمْ فِی الْفُلْکِ وَجَرَیْنَ بِهِمْ
بِرِیْحٍ طَیِّبَةٍ وَّفَرِحُوْا بِهَا جَآءَتْهَا رِیْحٌ عَاصِفٌ وَّجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِنْ کُلِّ
مَکَانٍ وَّظَنُّوْٓا اَنَّهُمْ اُحِیْطَ بِهِمْ دَعَوُا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ لَئِنْ اَنْجَیْتَنَا مِنْ
هٰذِهٖ لَنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۲۲﴾ فَلَمَّآ اَنْجٰهُمْ اِذَا هُمْ یَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ

---

بنانے لگتے ہیں[۳۱]۔ (اِن سے) کہو، اللہ اپنے حیلوں میں کہیں تیز ہے۔ (یاد رکھو)، جو حیلہ بازیاں تم کر رہے ہو، ہمارے فرشتے اُنھیں لکھ رہے ہیں[۳۲]۔ ۲۰-۲۱

(اِس کی مثال یہ ہے کہ) وہ اللہ ہی ہے جو تمھیں خشکی اور تری میں سفر کراتا ہے[۳۳]، یہاں تک کہ جب تم کشتی میں ہوتے ہو اور کشتیاں لوگوں کو لے کر موافق ہوا سے چل رہی ہوتی ہیں[۳۴] اور لوگ اُس سے شاداں و فرحاں ہوتے ہیں کہ یکایک اُس پر تند ہوا آجاتی ہے اور کشتی کے مسافروں پر ہر طرف سے موجیں اُٹھنے لگتی ہیں اور وہ سمجھ لیتے ہیں کہ طوفان میں گھر گئے۔ اُس وقت وہ اپنی اطاعت کو اللہ ہی کے لیے خالص کر کے اُس کو پکارنے لگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اِس سے نجات دے دی تو یقیناً ہم شکر گزار

---

ضد کے باعث خدا کا فیصلہ بن چکی ہے۔

۳۱؎ چنانچہ کبھی وعدے کرتے ہیں کہ اِس مرتبہ ہلاکت سے بچ گئے تو خدا کے شکر گزار بندے بن کر رہیں گے اور کبھی اِس طرح کے فلسفے بیان کرتے ہیں کہ یہ گردش زمانہ ہے۔ اِس قسم کے نرم گرم حالات ہر قوم کو پیش آتے ہیں۔ اِنھیں خدا کی تنبیہ یا عقیدہ و عمل کے کسی فساد کا نتیجہ کیوں سمجھا جائے؟

۳۲؎ یہ نہایت سخت تنبیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لکھ رہے ہیں تو عنقریب اِن حیلہ بازیوں کا نوٹس بھی لیں گے۔

۳۳؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ زمین میں سفر کے تمام ذرائع و وسائل خدا ہی کے پیدا کیے ہوئے ہیں اور وہ تدبیر و حکمت بھی اُسی نے عطا فرمائی ہے جس سے کام لے کر انسان نئی نئی ایجادات کرتا اور اِس طرح اپنے لیے سفر کی مزید سہولتیں پیدا کر لیتا ہے۔

۳۴؎ اصل میں فعل 'جَرَیْنَ' آیا ہے۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ لفظ 'فُلْك' مذکر مونث، واحد جمع، سب کے لیے آجاتا ہے۔ یہاں سے اسلوب میں بھی تبدیلی ہوئی ہے اور وہ تمثیل کے تقاضے سے حاضر کے بجائے غائب کا ہو گیا ہے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

الْحَقِّ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ مَّتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ اِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٢٣﴾ اِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ اَنْزَلْنٰهُ مِنَ السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْاَرْضِ مِمَّا يَاْكُلُ النَّاسُ وَالْاَنْعَامُ حَتّٰٓى اِذَآ اَخَذَتِ الْاَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ اَهْلُهَآ اَنَّهُمْ قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ اَتٰهَآ اَمْرُنَا لَيْلًا اَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا كَاَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْاَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ

---

ہو کر رہیں گے۔ پھر جب وہ اُنھیں نجات دے دیتا ہے تو فوراً ہی بغیر کسی حق کے[۳۵] زمین میں سرکشی کرنے لگتے ہیں۔ لوگو،[۳۶] تمھاری سرکشی کا وبال تمھی پر آنے والا ہے[۳۷]۔ دنیا کی زندگی کا نفع اٹھالو،[۳۸] پھر تم کو پلٹ کر ہمارے ہی پاس آنا ہے۔ اُس وقت ہم بتا دیں گے جو کچھ تم کر رہے تھے۔ دنیا کی یہ زندگی (جس نے تمھیں غفلت میں ڈال دیا ہے)، اِس کی مثال ایسی ہے جیسے بارش کہ ہم نے اُسے آسمان سے برسایا تو زمین کی نباتات خوب نکلیں، وہ بھی جنھیں آدمی کھاتے ہیں اور وہ بھی جنھیں جانور کھاتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب زمین رونق پر آگئی اور اُس نے اپنا بناؤ سنگھار کر لیا اور زمین والوں نے خیال کیا کہ اب وہ اُس پر پوری قدرت رکھتے ہیں[۳۹] تو اچانک رات یا دن میں (کسی وقت) ہمارا فیصلہ آ گیا،

---

تاکہ عموم پر دلالت کرے۔ تمثیلات میں یہی اسلوب زیادہ موزوں اور موثر ہوتا ہے۔

۳۵؎ یہ اِس لیے فرمایا ہے کہ مخلوق اپنے خالق کے سامنے سرکشی کرے تو وہ ہر حال میں بغیر کسی حق کے ہوگی۔

۳۶؎ یہاں سے خطاب پھر براہ راست قریش سے ہو گیا ہے۔

۳۷؎ یہ نہایت سخت وعید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمھاری یہ سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کر دے گی اور بالآخر اُس کے فیصلہ کن عذاب کی زد میں آ جاؤ گے جو کسی کو باقی نہ چھوڑے گا۔

۳۸؎ اصل الفاظ ہیں: 'مَتَاعَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا'۔ اِن میں لفظ 'مَتَاع' ایک فعل محذوف سے منصوب ہے۔ ہم نے ترجمے میں اُسے کھول دیا ہے۔

۳۹؎ یہ اُس حوصلے اور امنگ کی تعبیر ہے جس سے فصل کو اُس کے جوبن پر دیکھ کر اُس کے مالکوں کے دل لبریز ہو جاتے ہیں۔

الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ یَّتَفَکَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾

وَاللّٰہُ یَدْعُوْٓا اِلٰی دَارِ السَّلٰمِ وَیَھْدِیْ مَنْ یَّشَآءُ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ﴿۲۵﴾ لِلَّذِیْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰی وَزِیَادَۃٌ وَلَا یَرْھَقُ وُجُوْھَھُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّۃٌ اُولٰٓئِکَ اَصْحٰبُ الْجَنَّۃِ ھُمْ فِیْھَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَالَّذِیْنَ کَسَبُوا السَّیِّاٰتِ جَزَآءُ سَیِّئَۃٍ بِمِثْلِھَا وَتَرْھَقُھُمْ ذِلَّۃٌ مَالَھُمْ مِّنَ اللّٰہِ مِنْ عَاصِمٍ کَاَنَّمَآ اُغْشِیَتْ وُجُوْھُھُمْ

---

پھر ہم نے اُسے ایسا کاٹ کر ڈھیر کر دیا کہ گویا کل وہاں کچھ تھا ہی نہیں۔ ہم اُن لوگوں کے لیے جو غور کریں، اپنی نشانیاں اِسی طرح کھول کر بیان کرتے ہیں۔۲۲-۲۴

(لوگو، تم اِس زندگی کے فریب میں مبتلا ہو) اور اللہ تمھیں سلامتی کے گھر کی طرف[۴۰] بلاتا ہے اور (اِس کے لیے) جس کو چاہتا ہے، (اپنے قانون کے مطابق)، سیدھی راہ دکھا دیتا ہے[۴۱]۔ (پھر) جن لوگوں نے بھلائی کی، اُن کے لیے بھلائی ہے اور اُس پر مزید بھی۔ اُن کے چہروں پر نہ سیاہی چھائے گی نہ ذلت۔ وہی جنت کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ (اِس کے برخلاف) جنھوں نے برائیاں کمائی ہیں تو (خدا کا قانون یہ ہے کہ) برائی کا بدلہ اُس کے برابر ہے[۴۲]۔ سو اُن پر ذلت چھائے گی ـــــ اُنھیں کوئی خدا سے بچانے والا نہ ہوگا[۴۳] ـــــ اُن کے چہرے ایسے ہوں

---

۴۰؎ یعنی جنت کی طرف، جس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہاں نہ ماضی کے پچھتاوے ہوں گے نہ مستقبل کے اندیشے، وہ سراسر سلامتی ہوگی۔

۴۱؎ یعنی اِس قانون کے مطابق کہ جو سیدھی راہ کے سچے طالب ہوں، وہ اِس کے مستحق ہیں کہ اللہ اُنھیں سیدھی راہ دکھائے۔

۴۲؎ یعنی بھلائی کے لیے تو مزید بھی ہے، لیکن برائی کا بدلہ پورے انصاف کے ساتھ بالکل برابر ہے، اُس میں کمی بیشی نہ ہوگی۔

۴۳؎ سلسلۂ کلام کے بیچ میں یہ ایک جملہ معترضہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن ہستیوں سے مدد اور سفارش کی



www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

قِطَعًا مِّنَ الَّیۡلِ مُظۡلِمًا اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ النَّارِ هُمۡ فِیۡهَا خٰلِدُوۡنَ ﴿۲۷﴾

گے جیسے اندھیری رات کے ٹکڑوں سے ڈھانک دیے گئے ہیں۔ وہی دوزخ کے لوگ ہیں، وہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ ۲۵-۲۷

امیدیں باندھتے ہو، اُن میں سے کوئی بھی وہاں کام نہ آئے گا۔

[باقی]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

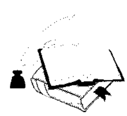

امین احسن اصلاحی
ترتیب وتدوین: خالد مسعود۔سعید احمد

# صدقہ کے بارے میں ترغیب

## (اَلتَّرْغِیْبُ فِی الصَّدَقَۃِ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حَدَّثَنِیْ مَالِکٌ عَنْ یَحْیَی بْنِ سَعِیْدٍ عَنْ أَبِی الْحُبَابِ سَعْدِ بْنِ یَسَارٍ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ تَصَدَّقَ بِصَدَقَۃٍ مِنْ کَسْبٍ طَیِّبٍ، وَلَا یَقْبَلُ اللّٰہُ اِلَّا طَیِّبًا کَانَ اِنَّمَا یَضَعُھَا فِیْ کَفِّ الرَّحْمٰنِ یُرَبِّیْھَا کَمَا یُرَبِّی اَحَدُکُمْ فَلُوَّہُ اَوْ فَصِیْلَہُ حَتّٰی تَکُوْنَ مِثْلَ الْجَبَلِ.

سعد بن یسار رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنی پاک کمائی سے صدقہ کرے، اور اللہ پاک کمائی ہی قبول کرتا ہے، تو گویا وہ خدائے رحمٰن کے ہاتھ میں اس کو رکھتا ہے جو اس کو نشوونما دے کر بڑھاتا ہے، جیسا کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے بچھڑے کو یا اپنے اونٹ کے بچے کو بڑھاتا ہے، یہاں تک کہ وہ صدقہ پہاڑ کی مانند ہو جاتا ہے۔

### وضاحت

’فصیلۃ‘ دودھ چھوڑے ہوئے بچے کو کہتے ہیں۔

قرآن مجید میں یوں آیا ہے 'یَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَ يُرْبِي الصَّدَقٰتِ'۔البقرہ۲:۲۷۶(اللہ سود کو گھٹائے گا اور صدقات کو بڑھائے گا)۔جو صدقات اللہ کی راہ میں دیے جاتے ہیں، اللہ تعالیٰ ان کو بڑھاتا ہے، اور اللہ جتنا چاہے بڑھائے۔ یہاں وضاحت کر دی گئی ہے کہ وہ بڑھا کر پہاڑ کی مانند کر دیتا ہے۔آپ چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں، اس کی مثال ایسی ہے گویا آپ نے اس کو خدائے رحمان کے ہاتھ میں دے دیا کہ وہ اس کو اس طریقہ سے بڑھائے، جس طریقہ سے آپ اپنے بچھڑے کو پالتے ہیں یا اونٹ کے بچے کی پرورش کرتے ہیں تو وہ بڑا ہو جاتا ہے۔

صدقات کی زیادت ہونی چاہیے اور چھوٹی یا بڑی جو چیز بھی دیں تو اس میں خلوص شامل ہونا چاہیے، کیونکہ اصل قدر و قیمت تو خلوص کی ہے۔

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ اِسْحٰقَ بْنِ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ اَبِیْ طَلْحَةَ اَنَّهُ سَمِعَ اَنَسَ بْنَ مَالِكٍ يَقُوْلُ كَانَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَكْثَرَ اَنْصَارِيٍّ بِالْمَدِيْنَةِ مَالًا مِنْ نَخْلٍ، وَ كَانَ اَحَبُّ اَمْوَالِهِ اِلَيْهِ بَيْرُحَاءَ وَكَانَتْ مُسْتَقْبِلَةَ الْمَسْجِدِ وَ كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَدْخُلُهَا وَ يَشْرَبُ مِنْ مَاءٍ فِيْهَا طَيِّبٍ. قَالَ اَنَسٌ فَلَمَّا اُنْزِلَتْ هٰذِهِ الْاٰيَةُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ قَامَ اَبُوْ طَلْحَةَ اِلٰى رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى يَقُوْلُ: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ. وَ اِنَّ اَحَبَّ اَمْوَالِيْ اِلَيَّ بَيْرُحَاءُ، وَ اِنَّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ اَرْجُوْا بِرَّهَا وَذُخْرَهَا عِنْدَ اللّٰهِ فَضَعْهَا يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ حَيْثُ شِئْتَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَبَخْ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ وَقَدْ سَمِعْتُ مَا قُلْتَ فِيْهِ وَ اِنِّيْ اَرٰى اَنْ تَجْعَلَهُ فِي الْاَقْرَبِيْنَ، فَقَالَ اَبُوْ طَلْحَةَ اَفْعَلُ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ فَقَسَمَهَا اَبُوْ طَلْحَةَ فِيْ اَقَارِبِهِ وَ بَنِيْ عَمِّهِ.

اسحٰق بن عبداللہ بن ابی طلحہ نے انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو فرماتے سنا کہ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ مدینہ میں کھجوروں کے باغ کے لحاظ سے سب سے زیادہ رئیس انصاری تھے۔ اور ان کا محبوب ترین باغ بیرحاء تھا جو مسجد (یعنی مسجد نبوی) کے بالمقابل تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس میں تشریف لایا کرتے اور اس میں سے شیریں اور ٹھنڈا پانی پیا کرتے۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ جب یہ آیت اتری: 'لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ' (تم خدا سے وفاداری کے مقام کو نہیں پا سکتے جب تک کہ اپنے محبوب مال میں سے نہ خرچ کرو) تو ابوطلحہ اٹھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا: یا رسول اللہ، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تم اللہ تعالیٰ کی وفاداری کا درجہ حاصل نہیں کر سکتے جب تک کہ تم خرچ نہ کرو اس چیز سے جو تمھیں سب سے زیادہ محبوب ہے، تو میرا سب سے زیادہ محبوب مال باغ بیرحاء ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں صدقہ ہے، اب میں اس کا صلہ اور اجر اللہ کے ہاں چاہتا ہوں۔ یا رسول اللہ، آپ جہاں چاہیں، اس کو صرف کریں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سبحان اللہ! ماشاء اللہ! بہت اچھا مال ہے۔ یہ بہت نفع بخش باغ ہے۔ میں نے سن لی وہ بات جو تم نے کہی ہے۔ اب میری رائے یہ ہے کہ تم اس کو اپنے اقرباء میں تقسیم کر دو۔ ابوطلحہ نے کہا: یا رسول اللہ، میں ایسے ہی کروں گا۔ تو ابوطلحہ نے اسے اپنے اقرباء اور اپنے چچازاد بھائیوں میں تقسیم کر دیا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

### وضاحت

'بخ' وہی لفظ ہے جو پیچھے ایک روایت میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے لیے بطور طنز استعمال کیا۔ یہ تین چار شکلوں میں آتا ہے۔ یہاں یہ لفظ تحسین کے لیے آیا ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید سے کس طرح متاثر ہوتے تھے۔ ان کے مقابلے میں آج ہمیں اپنے رویے پر نظر کرنی چاہیے کہ ہم قرآن مجید کے معاملے میں کس قدر بلید ہو گئے ہیں۔

اس حدیث سے خاص بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اگر کوئی شخص چاہے تو صدقہ کے مصارف میں اپنے اعزہ واقرباء اور اپنے بنی اعمام کو، جن کی حالت محتاج اصلاح ہو، شامل کر سکتا ہے۔ ان کی بہبود کے لیے صدقہ کے مال سے ان کی مدد کر سکتا ہے۔ محتاج کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آدمی بالکل ہی تہی دست ہو، دو روٹی کا محتاج ہو۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ

عنہ نے باغ اپنے جن اقرباء اور بنی اعمام میں تقسیم کیا، ان کے متعلق قطعی طور پر معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی محتاج نہیں تھا۔ حضرت حسان رضی اللہ عنہ بھی ان کے خاندان میں سے تھے۔ اس باغ میں سے ان کو جو حصہ ملا تھا، وہ انھوں نے بنوامیہ کے زمانے میں ایک لاکھ درہم میں بیچا تھا۔

قرآن مجید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں، البتہ ان کے وصول کرنے میں فرق ہے۔ اگر آپ زکوٰۃ نہیں دیں گے تو حکومت وصول کر لے گی، لیکن صدقات کی ادائیگی آپ کی صوابدید پر ہے۔

ہمارے فقہا نے حد مقرر کر رکھی ہے کہ اگر کسی غریب کے پاس اتنی مالیت کا مال ہو تو اس کو زکوٰۃ نہیں دینی چاہیے۔ اس زمانے میں اتنی مالیت سے تو آدمی ایک وقت کی روٹی نہیں کھا سکتا۔ یہ بات غلط ہے۔ اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود لوگوں کی بہبود اور ترقی ہے۔ معاشرہ میں ان کے مقام کو بلند کیا جائے۔ اگر وہ کاروبار کرتے ہیں تو ان کو سہولت حاصل ہو جائے اور کام کرتے ہیں تو اس میں ان کو آسانیاں مل جائیں اور وہ ترقی کر کے اس کو بڑھا لیں۔ اس زمانے میں رفاہی ریاست کا بہت چرچا ہے۔ رفاہی ریاست قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ زکوٰۃ کے جتنے بھی احکام ہیں، ان کو قرآن مجید کے مطابق ٹھیک کیا جائے۔ زکوٰۃ ہر مال میں ہے۔ اس میں سے مستثنیٰ صرف مقدار ہے۔ بڑے پیمانے پر جو چیز بھی کاشت ہو گی، اس پر زکوٰۃ ہو گی۔ حکومت زکوٰۃ کے اموال سے اجتماعی بہبود اور رفاہیت کے کام کر سکتی ہے۔ زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف میں کوئی فرق نہیں، دونوں کا مصرف ایک ہے۔ یہ یتیموں، غریبوں، مسکینوں اور محتاجوں کی بہبود، ترقی اور اصلاح کے لیے خرچ ہوں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

حَدَّثَنِیْ مَالِكٌ عَنْ زَیْدِ بْنِ أَسْلَمَ أَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّى اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ أَعْطُوا السَّائِلَ وَ اِنْ جَاءَ عَلٰى فَرَسٍ.

زید بن اسلم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سائل کو دو، اگرچہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے۔

### وضاحت

یہ روایت موقوف ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہے کہ جو مانگتا ہے، اس کو دیں۔ اس کے بارے میں زیادہ تحقیق نہیں کرنی چاہیے۔ سائل کے لیے یہ کیا کم ہے کہ اس نے اپنی ناموس اور اپنی آبرو کو آپ کے سامنے پیش کر دیا ہے۔

جس نے اتنی بڑی قربانی دی ہے، اس کی زیادہ کرید نہیں کرنی چاہیے، الاّ آنکہ یہ واضح ہو کہ یوں ہی بھگل بنائے ہوئے ہو یا پیشہ ور ہے۔ ظاہری حالت پر قیاس کر کے انکار کرنا صحیح نہیں۔ ہوسکتا ہے کہ سائل لنگڑا ہو تو سوار ہو کر آیا ہو یا اس کے پاس گھوڑا تو ہے، لیکن اس کی ضروریات، بلکہ اپنی بھی ضروریات نہیں ہیں اور حالات نے اسے مانگنے پر مجبور کر دیا ہے۔

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ عَنْ زَيْدِ بْنِ أَسْلَمَ عَنْ عَمْرِو بْنِ مُعَاذٍ الْأَشْهَلِيِّ الْاَنْصَارِيِّ عَنْ جَدَّتِهِ اَنَّهَا قَالَتْ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَا نِسَاءَ الْمُؤْمِنَاتِ لَا تَحْقِرَنَّ اِحْدَا كُنَّ اَنْ تُهْدِیَ لِجَارَتِهَا وَلَوْ كُرَاعَ شَاةٍ مُحْرَقًا.

عمرو بن معاذ الاشہلی الانصاری اپنی دادی سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے مومنہ عورتو، تم میں سے کوئی بھی اس بات کو حقیر نہ سمجھے کہ وہ اپنی پڑوسن کے لیے کوئی حقیر سے حقیر ہدیہ بھیجے، اگرچہ وہ بکری کی ایک جلی ہوئی کھری ہو۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## وضاحت

یہ واقعہ ہے کہ ہدیہ محبت بڑھانے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ اپنی توفیق کے مطابق جو کچھ بھی میسر ہو اور جب بھی موقع نکلے ہدیہ دینا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہدیہ شان دار ہو تب دے۔ کوئی چیز جو ذرا بھی ندرت رکھتی ہو، پڑوسی کو ضرور بھیجنی چاہیے۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی کی تلقین کی ہے اور یہ چیز معاشرت پر بہت مفید اثرات ڈالتی ہے۔

اس حدیث میں 'نساء المومنات' کی ترکیب شاذ ہے۔ میرے نزدیک تو یہ ہے کہ جس طریقہ سے نکرہ موصوف معرفہ بن جاتا ہے، اسی طریقہ سے منادیٰ بھی معرفہ کا مقام حاصل کر لیتا ہے، اس لیے اس کی صفت معرفہ آسکتی ہے۔ واللہ علم عند اللہ۔

حَدَّثَنِی عَنْ مَالِكٍ أَنَّهُ بَلَغَهُ عَنْ عَائِشَةَ زَوْجِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ

وَ سَلَّمَ اَنَّ مِسْكِينًا سَأَلَهَا وَهِيَ صَائِمَةٌ وَلَيْسَ فِي بَيْتِهَا اِلَّا رَغِيفٌ فَقَالَتُ لِمَوْلَاةٍ لَهَا أَعْطِيهِ اِيَّاهُ، فَقَالَتُ لَيْسَ لَكِ مَا تُفْطِرِينَ عَلَيْهِ، فَقَالَتُ أَعْطِيهِ اِيَّاهُ قَالَتُ فَفَعَلْتُ. قَالَتُ فَلَمَّا أَمْسَيْنَا أَهْدٰى لَنَا أَهْلُ بَيْتٍ اَوُ اِنُسَانٌ مَا كَانَ يُهْدِيُ لَنَا شَاةً وَ كَفُنَهَا فَدَعَتْنِيُ عَائِشَةُ أُمُّ الْمُؤْمِنِينَ، فَقَالَتُ كُلِيُ مِنُ هٰذَا هٰذَا خَيْرٌ مِنُ قُرْصِكِ.

امام مالک کہتے ہیں کہ مجھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زوجہ محترمہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین ان کے پاس آیا اور اس نے کچھ سوال کیا اور وہ روزہ سے تھیں۔ گھر میں ایک چپاتی کے سوا کچھ نہیں تھا۔ انھوں نے اپنی آزاد کردہ لونڈی سے کہا کہ یہ اسے دے دو۔ اس نے کہا کہ افطار کرنے کے لیے آپ کے لیے کچھ نہیں رہے گا۔ تو انھوں نے کہا کہ تم دے دو۔ وہ کہتی ہیں کہ میں نے چپاتی سائل کو دے دی۔ جب شام ہوئی تو ہمارے لیے ایک ایسے خاندان والوں نے یا ایک شخص نے بکری کا گوشت بھیجا جن کو ہمارے ہاں ہدیہ بھیجنے کی مستقل عادت نہ تھی۔ ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے مجھے بلایا اور کہا: لو اس میں سے کھاؤ۔ یہ اس چپاتی سے بہتر ہے جو تم نے دی۔

### وضاحت

'بکری بھیجی' یہ عربیت کا اسلوب ہے کہ کل بول کر جزء مراد ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ پوری بکری بھیجی۔ آپ بھی مہمان کی تواضع کے لیے مرغی ذبح کرتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ آپ نے مہمان کو مرغی کھلائی، حالاں کہ اس میں سے اور لوگوں نے بھی کھایا ہوتا ہے۔

'وَ كَفُنَهَا' میں واو عطف کا نہیں مادے کا حصہ ہے۔ 'وکف' کے معنی میں قطرہ قطرہ ٹپکنے کا مفہوم ہے، گویا یہ خاندان مسلسل ہدیہ نہیں بھیجتا تھا۔ بعض لوگوں نے واو کو حرف عطف مانا ہے اور 'کَفَنَ' کو ڈھانکنے کے معنی میں لیا ہے، یعنی اس پر روٹیاں ڈھانپ رکھی تھیں۔ لوگوں نے اور شرحیں بھی لکھی ہیں۔ بہر حال یہ لفظ مزید تحقیق طلب ہے۔ اس بات کا امکان بھی ہے کہ یہ لفظ غلط ضبط ہو گیا ہو۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ روایت امام مالک کی بلاغات میں سے ہے اور اس بات کی دلیل ہے کہ جب کوئی سائل آئے تو اس کو دینا چاہیے اور اسی طریقہ سے دینا چاہیے جس طریقہ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے دیا۔ تجربہ یہی ہے کہ اگر آپ اس طریقہ سے دیں گے تو ان شاء اللہ آپ بھوکے نہیں رہیں گے، اچھا کھائیں گے۔

حَـدَّثَنِیْ عَنْ مَالِكٍ قَالَ بَلَغَنِیْ اَنَّ مِسْكِیْنًا اسْتَطْعَمَ عَائِشَةَ أُمَّ الْمُؤْمِنِیْنَ وَ بَیْـنَ یَـدَیْهَـا عِـنَـبٌ، فَقَالَتْ لِاِنْسَان خُذْ حَبَّةً فَأَعْطِهِ اِیَّاهَا فَجَعَل یَنْظُرُ اِلَیْهَـا وَ یَـعْـجَـبُ، فَـقَـالَـتْ عَائِشَةُ أَتَعْجَبُ كَمْ تَرٰی فِیْ هٰذِهِ الْحَبَّةِ مِنْ مِثْقَالِ ذَرَّةٍ.

امام مالک کہتے ہیں کہ مجھے یہ بات پہنچی کہ ایک مسکین نے ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے کھانا مانگا۔ ان کے آگے کچھ انگور تھے۔ انھوں نے کسی سے کہا کہ اس میں سے ایک دانہ لے کر اس کو دے دو تو وہ تعجب سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا منہ دیکھنے لگا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا کہ تم تعجب کرتے ہو! اس میں نہ جانے کتنے مثقال ذرہ ہوں گے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## وضاحت

'عِـنَبٌ' یہاں نکرہ ہے جو تحقیر کے لیے بھی آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تھوڑے سے انگور یا کچھ انگور۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اگر کہتیں تو یہ کہتیں کہ دے دو جتنے بھی ہیں۔ سیدہ عائشہ کے کردار سے یہ بعید ہے کہ انھوں نے یہ کہا ہوگا کہ اس میں سے ایک دانہ اٹھا کر دے دو۔ بہرحال یہ امام مالک کی بلاغات میں سے ہے۔ میں اس کی ذمہ داری نہیں لیتا۔

امین احسن اصلاحی

# معاشرہ کی اصلاح کے وسائل

اصلاح معاشرہ کے جن پہلوؤں کی طرف ہم نے توجہ دلائی ہے، بہت سے دردمندوں نے ان کی اہمیت محسوس کی ہے۔ اس اثنا میں ہمیں جو خطوط موصول ہوئے ہیں، ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ایسے لوگ بحمد اللہ ہمارے اندر موجود ہیں جو صورت حال کی نزاکت کا احساس رکھتے ہیں اور دین کے بقاو تحفظ کے لیے وہ اپنا وقت بھی صرف کرنے کے لیے تیار ہیں اور ان میں سے جن کو خدا نے مال دیا ہے، وہ اپنا مال بھی خرچ کرنے کے لیے آمادہ ہیں۔ ان خطوط سے ہمیں بڑی تقویت حاصل ہوئی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے دردمندوں کی تعداد میں اضافہ فرمائے۔

کسی معاشرہ کے اندر ہزار خرابیاں موجود ہوں، لیکن جب تک اس کے اندر ان خرابیوں کو محسوس کرنے والے اور ان کو دور کرنے کی راہ میں ایثار کرنے والے افراد موجود رہیں، اس وقت تک اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ کسی معاشرہ کی حالت مایوس کن اس وقت ہوتی ہے، جب اس کا بگاڑ اس حد کو پہنچ جائے کہ نہ اس کی اصلاح کے لیے اپنا وقت اور مال قربان کرنے والے باقی رہ جائیں اور نہ اس کی حالت پر غم کھانے والے۔ الحمدللہ ہمارا بگاڑ ابھی اس حد کو نہیں پہنچا ہے۔

لیکن ان خطوط سے جہاں ہمیں یہ اندازہ کر کے خوشی ہوئی ہے کہ ہمارے اندر ایسے لوگ موجود ہیں جو اپنے وسائل و ذرائع اسلام کے لیے استعمال کرنے پر آمادہ ہیں۔ وہیں انھی خطوط سے ہمیں یہ اندازہ بھی ہوا ہے کہ ابھی اس معاملہ کے بعض گوشے لوگوں کے سامنے اچھی طرح واضح نہیں ہیں۔ ہمارا خیال یہ ہے کہ جب تک یہ گوشے اچھی طرح واضح نہیں ہوں گے، اس وقت تک یہ احساس، جس کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے، کوئی مفید نتیجہ نہیں پیدا کر

سکتا۔اس وجہ سے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم ان پہلوؤں کی طرف بھی چند سطروں میں توجہ دلا دیں۔

اس وقت جو لوگ اس مقصد کے لیے اپنے مال یا وقت کی کوئی قربانی دینا چاہتے ہیں، انھیں دو باتوں پر اچھی طرح غور کرکے اپنے ذہن کو یک سو کر لینا چاہیے۔

ایک اس بات پر کہ اس وقت اسلام کے لیے جو مرحلہ درپیش ہے، اس مرحلہ میں اسلام کی خدمت کے لیے سب سے مقدم اور سب سے زیادہ ضروری کام کیا ہے؟ دوسرے اس بات پر کہ اس وقت جو وسائل و ذرائع میسر ہیں، ان کو اس مقدم اور ضروری کام کے لیے زیادہ سے زیادہ بہتر طریقہ پر کس طرح استعمال کیا جا سکتا ہے؟

ان دونوں سوالوں پر غور کیے اور ان کے باب میں یک سو ہوئے بغیر جو کام اس وقت کیے جائیں گے، ہمیں اندیشہ ہے کہ ان پر ہماری مادی و ذہنی طاقتیں تو صرف ہوں گی، لیکن ان سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا اور ہو گا تو اتنا کم کہ وہ نہ ہونے کے برابر ہو گا۔

پہلے سوال پر غور کرنے کی ضرورت اس وجہ سے ہے کہ یہ بات تو بہت سے لوگ جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ بیمار ہے، لیکن اس امر میں بڑا اختلاف ہے کہ یہ بیماری کیا ہے اور اس کا علاج کیا ہے؟ اس بیماری اور اس کے علاج کے متعین نہ ہونے کے سبب سے ہر تیماردار الگ الگ مرض تشخیص کر رہا ہے اور الگ الگ اس کے علاج تجویز کر رہا ہے۔ بعض لوگ اس کے ہاتھ پاؤں کو مریض سمجھ رہے ہیں اور اپنی اس تشخیص کے مطابق اس کے پاؤں پر مالش کرنا چاہتے ہیں۔ بعض اس کے پیٹ میں درد خیال کر رہے ہیں اور اپنی سمجھ کے مطابق اس درد کی تسکین کی کوئی دوا دینا چاہتے ہیں۔ بعض اس کو ضعف قلب کا مریض سمجھتے ہیں، وہ اس ضعف قلب کو دور کرنے کے لیے کوئی مقوی قلب چیز اس کو کھلانا چاہتے ہیں۔ غرض جتنے تیماردار ہیں، اتنی ہی تشخیصیں اور اتنے ہی علاج ہیں۔ یہ اختلاف تشخیص و اختلاف علاج اگرچہ زیادہ تر نتیجہ ہے اس ذہنی پریشانی کا جس سے ایک ہمہ گیر خرابی کے احساس نے ہمیں دوچار کر دیا ہے اور اس پہلو سے یہ ایک قدرتی سی چیز ہے، لیکن کسی موثر اور نتیجہ خیز علاج کے لیے اس پریشان خیالی کا دور ہونا ضروری ہے۔ جب کسی گھر میں آگ لگتی ہے تو بالعموم یہی ہوتا ہے کہ جس جس کونے سے بھی دھواں اٹھتا نظر آتا ہے، پاس پڑوس کے ہمدرد اسی کونے کو آگ کا مرکز سمجھ کر اس پر اپنے اپنے پانی کے ڈول پھینکنے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ کام اگرچہ وہ ازراہ ہمدردی کرتے ہیں، لیکن منتشر کوششوں سے آگ نہیں بجھا کرتی۔ آگ بجھتی اس وقت ہے جب فائر بریگیڈ آگ کے اصل سنٹر کو متعین کر کے اس کو اپنے محاصرے میں لے لیتا ہے اور اپنے زوردار دونگڑوں سے اس کے سر غرور کو کچل کے رکھ دیتا ہے۔

دوسرے سوال پر غور کرنے کی ضرورت یوں ہے کہ اس مقصد کے لیے جو اسباب و وسائل اس وقت میسر ہیں یا

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

آئندہ جن کے میسر آنے کی توقع ہے، وہ بہر حال نہایت محدود بھی ہیں اور نہایت منتشر حالت میں بھی ہیں۔ اگر یہ اسباب و وسائل الگ الگ مختلف مقامات پر استعمال ہوں تو کہیں بھی ان سے کوئی بڑے پیمانہ کا کوئی ایسا نتیجہ خیز کام نہیں انجام پا سکتا جو اس ضرورت کو پورا کر سکے جس کو پورا کرنا پیش نظر ہے۔ پھر مادی وسائل سے زیادہ اہم سوال اس مقصد کے لیے ذی صلاحیت اور موزوں اشخاص کی فراہمی ہے۔ اس زمانہ میں کسی اس طرح کے کام کے لیے سرمایہ حاصل کرنا جتنا مشکل ہے، اس سے کہیں زیادہ مشکل اس کے لیے اس دور قحط الرجال میں آدمیوں کی تلاش ہے۔

ان دونوں سوالوں میں سے جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے، اس پر ہم نے جس حد تک غور کیا ہے ہم اسی نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ہماری بیماری کوئی سرسری اور معمولی قسم کی نہیں ہے، بلکہ بڑی گہری ہے۔ انگریزوں کے تسلط کے بعد سے مغربی فکر و فلسفہ کی جو چھوت ہمیں لگی، اس نے ڈیڑھ دو سو سال کی مدت میں ایک مزمن بیماری کی شکل اختیار کر لی ہے اور اب اس نے ہمارے ذہین طبقہ کے دماغ اور دل بالکل ماؤف کر دیے ہیں۔ اس بیماری کا عمل تقریباً یک طرفہ قسم کا رہا ہے۔ اس کے تدارک کی تدبیریں یا تو اختیار ہی نہیں کی گئیں یا اختیار کی گئیں تو وہ اتنی سائنٹیفک اور علمی نہیں تھیں جتنا سائنٹیفک اور علمی اس کا عمل تھا، اس وجہ سے آہستہ آہستہ اس کے اثرات دماغوں اور دلوں کے اندر اتنے گہرے اتر چکے ہیں کہ اب اس حقیقت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ ان سے ہمارے ذہین طبقہ کی اکثریت کے عقائد و ایمانیات کی جڑیں تک ہل چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ کسی قوم کے ذہین طبقہ کی بیماری اعضا و جوارح کی بیماری نہیں ہے، بلکہ اس کے دماغ اور عقل کی بیماری ہے اور دماغ کی خرابی ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ایک ایسی بیماری ہے جس کا علاج نہ تو دردسر کی دوا سے ہو سکتا ہے اور نہ ہر عطائی اس کا علاج کر سکتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہ مغرب کی فاسد عقلیت کا ایک عذاب ہے جو ہم پر مسلط ہوا ہے۔ اس فاسد عقلیت کا مداوا اگر ہو سکتا ہے تو اس صالح عقلیت ہی سے ہو سکتا ہے جو قرآن اور سنت کی حکمت کے اندر مضمر ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کام ہر شخص کے بس کا نہیں ہے۔ یہ کام وہی لوگ کر سکتے ہیں جو دین کی عقلیت کے بھی راز داں ہوں اور جو موجودہ عقلیت کے مفاسد سے بھی اچھی طرح واقف ہوں اور ساتھ ہی اس معیار و پیمانہ پر اور اس انداز اور اس طریقہ سے اس کام کو کر سکنے کا سلیقہ رکھتے ہوں جو موجودہ زمانہ میں اس طرح کے کام کے لیے وجود میں آچکا ہے۔ یہ ایک ٹھوس علمی اور تحقیقی کام ہے جس کا فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکنے کی توقع ہے جب ایک ٹیم پرسکون ماحول اور اطمینان بخش حالات کے اندر اس خدمت کے لیے اپنے آپ کو دوسری تمام دل چسپیوں اور ہنگامی مشاغل سے فارغ کر لے اور اپنی محنتوں سے ان تمام زہروں کے تریاق بھی فراہم کرے جن سے اس وقت ہمارے معاشرے کا ذہین طبقہ مسموم ہے اور ساتھ

ہی ان لوگوں کی تربیت بھی کرے، جو آئندہ نسلوں کے لیے اس خدمت کو جاری رکھ سکیں۔

دوسرے سوال سے متعلق ہمارا مشورہ اسلام اور مسلمانوں کے ان تمام بہی خواہوں کے لیے جو اس عظیم خدمت میں اپنے وسائل و ذرائع سے حصہ لینا چاہتے ہیں یہ ہے کہ وہ اسلام کے وسیع مفاد کے پیش نظر اپنے شخصی اور مقامی میلانات ور جحانات کو اس وقت بھول جائیں۔ پیش نظر کام ایک بڑا وسیع کام ہے، اس کو صحیح طور پر انجام دینے کے لیے وسیع اسباب و وسائل کی ضرورت ہے جن کے فراہم ہونے کی توقع صرف اسی شکل میں ہوسکتی ہے جب تمام اصحاب وسائل مل کر اپنی متحدہ کوشش سے فراہم کریں۔ متحدہ کوشش کی صورت میں تو بلاشبہ اس بات کی توقع ہے کہ اس کام کے لیے ضرورت کے مطابق سرمایہ بھی حاصل ہو جائے اور اس کا بھی امکان ہے کہ اس کام کو چلانے کے لیے موزوں اشخاص بھی مل جائیں۔ لیکن اگر وسائل رکھنے والے حضرات کسی ایک اسکیم پر متفق نہ ہو سکے تو اس صورت میں کسی بڑے کام کے انجام پا سکنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ زیادہ سے زیادہ بس یہ ہو سکے گا کہ بعض لوگ اپنے اپنے شہروں میں ایک آدھ بے مقصد قسم کے مدرسے اور قائم کر دیں گے یا اپنے دیہاتوں میں وعظ کہنے کے لیے ایک آدھ مبلغ بھیج دیں گے۔ اس سے ان مدرسوں کے بانیوں اور ان مبلغوں کے سرپرستوں کو تو ضرور تسلی ہو جائے گی کہ انھوں نے دین کی کوئی خدمت انجام دی ہے، لیکن ان مدرسوں اور ان مبلغوں سے اس اسلام کا کیا بھلا ہوگا جس کی بنیادیں تک ہمارے معاشرے کے اندر ہل چکی ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اس کام کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے عام معاشرہ کی دینی و اخلاقی اصلاح کی جدوجہد بھی شروع کی جائے۔ اس کا زوال و انحطاط اب خطرہ کے پوائنٹ تک پہنچ چکا ہے۔ اب اس کام میں مزید غفلت کے معنی اس کو اسلامی نقطۂ نظر سے موت کے حوالہ کر دینے کے ہوں گے۔ ابھی تو اس بات کا امکان ہے کہ اگر سمجھ دار بے لوث اور مخلص لوگوں کی ایک جماعت اس کی اصلاح کے لیے اٹھ کھڑی ہو تو شاید اللہ تعالیٰ اس کی کوششوں سے اس کی حالت کو سنبھال دے، لیکن اگر یہ کوشش نہ کی گئی تو زیادہ عرصہ نہیں گزرے گا کہ اس کے لیے گمراہی کا ہر موڑ مڑ جانا بالکل متوقع ہوگا اور عنداللہ اس کی ذمہ داری ان لوگوں پر ہوگی جو اس کی اصلاح کے سلسلہ میں کچھ کر سکنے کی صلاحیت رکھتے تھے، لیکن انھوں نے کچھ نہیں کیا۔ جن لوگوں کے نزدیک سیاسی اقتدار کے حصول کے بغیر اصلاح معاشرہ کی کوئی جدوجہد ممکن ہی نہیں ہے، انھیں ہم ان کے نظریے کی بنا پر مجبور سمجھتے ہیں، لیکن جو لوگ سیاست سے الگ رہ کر بھی اسلام کی خدمت کر سکنے کے امکانات کے قائل ہیں، ہم انھیں ان کی ذمہ داری یاد دلانا چاہتے ہیں۔

---

محمد وسیم اختر مفتی

# حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ

حضرت عامر بن ربیعہ رضی اللہ عنہ کے نسب میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ علماے علم نسب کی اکثریت کا کہنا ہے کہ وہ عنز بن وائل کی اولاد میں سے تھے، اس لیے عنزی کہلاتے تھے۔ بکر بن وائل اور تغلب بن وائل کے بھائی عنز بن وائل حضرت عامر کے دسویں جد تھے۔ کچھ لوگ ان کا نسب یمن کے قبیلہ بنو مذحج سے جوڑتے ہیں۔ عنزہ بن اسد بن ربیعہ بھی ان کی نسبت بیان کی گئی ہے، تاہم طبری نے اس کا رد کیا ہے۔ عامر کے دادا کا نام کعب بن مالک تھا۔ سلسلۂ نسب کی دو شاذ روایتوں کے مطابق ان کے دادا کا نام مالک بن عامر یا عامر بن مالک تھا۔ نسابین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ وہ بنو عدی کے عبدالعزیٰ کے بیٹے اور حضرت عمر کے والد خطاب بن نفیل کے معاہد و حلیف تھے، اس لیے ان کو عدوی بھی کہا جاتا تھا۔ خطاب نے عامر کو منہ بولا بیٹا بنا رکھا تھا۔ چنانچہ انھیں عامر بن خطاب کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۵ میں اللہ کا یہ فرمان نازل ہوا:

اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَ هُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِي الدِّيْنِ.

”لے پالکوں کو ان کے باپوں کے نام سے پکارو، یہی اللہ کے ہاں زیادہ قرین انصاف ہے۔ اور اگر تمھیں ان کے آبا کا علم ہی نہ ہو تو تمھارے دینی بھائی اور تعلق دار ہیں۔“

تو انھیں ان کے اصل نام عامر بن ربیعہ سے پکارا جانے لگا۔

ابو عبداللہ حضرت عامر کی کنیت تھی۔

حضرت عامر بن ربیعہ کا شمار السابقون الاولون میں ہوتا ہے۔ وہ اسلام کی حقانیت پر ایمان لانے والے اٹھائیسویں

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

فرد تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی دار ارقم میں تشریف نہ لائے تھے۔ حضرت عامر نے زمانۂ جاہلیت کے موحد زید بن عمرو بن نفیل سے نبی موعود صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات اور ان کی نشانیاں سن رکھی تھیں، یہی وجہ ہے کہ انھیں اسلام کی طرف سبقت کرنے میں کوئی تامل نہ ہوا۔ زید نے کہا تھا کہ میں اسماعیل علیہ السلام کی اولاد، بنو عبدالمطلب میں ایک نبی کی آمد کا انتظار کر رہا ہوں۔ اگر تمھیں زندگی نے مہلت دی اور انھیں دیکھنے کا اتفاق ہوا تو میرا اسلام کہہ دینا۔ چنانچہ عامر مسلمان ہوئے تو آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو زید کا سلام پہنچایا۔ آپ نے سلام کا جواب دیا، زید کے لیے دعاے رحمت کی اور فرمایا: میں انھیں جنت میں ناز و انداز کے ساتھ چلتے پھرتے دیکھ رہا ہوں۔

۵/ نبوی میں قریش کے مظالم سے پسے ہوئے اہل ایمان سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''کاش تم سرزمین حبشہ کی طرف ہجرت کر جاتے اور وہاں اس وقت تک قیام کرتے جب تک اللہ کشادگی کی راہ نہ نکال دیتا۔ حبشہ امن اور سچائی کی سرزمین ہے، وہاں ایسا بادشاہ حکمران ہے جس کے ہاں کسی پر ظلم نہیں ہوتا۔'' چنانچہ رجب ۵/ نبوی میں اہل ایمان کا پہلا قافلہ حضرت عثمان بن مظعون کی قیادت میں سوے حبشہ عازم ہجرت ہوا۔ حضرت عثمان بن عفان، ان کی اہلیہ حضرت رقیہ بنت رسول اللہ، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، ان کی بیوی حضرت سہلہ بنت سہیل، حضرت زبیر بن عوام، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت ابوسلمہ، ان کی زوجہ حضرت ام سلمہ، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت عامر بن ربیعہ، ان کی بیوی حضرت لیلیٰ بنت ابوحثمہ (شاذ روایات: خیثمہ یا حذافہ)، حضرت ابوسبرہ بن ابو رہم، حضرت حاطب بن عمرو، حضرت سہیل بن بیضا اور حضرت عبداللہ بن مسعود اس قافلۂ اولین میں شامل تھے۔ ابن اسحاق نے دس اور ابن خلدون نے گیارہ کا عدد بیان کیا ہے، تاہم طبری اور ابن ہشام نے چودہ صحابہ شمار کیے ہیں جو نصف دینار کرایہ ادا کر کے ایک یا دو کشتیوں پر حبشہ گئے۔ مندرجہ بالا فہرست میں ہم نے مختلف روایتوں کو جمع کر کے سولہ صحابہ کے نام تحریر کیے ہیں۔ قریش نے مہاجرین کا پیچھا کیا، لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آ سکے۔ چند ماہ کے بعد حضرت جعفر بن ابو طالب کی قیادت میں سڑسٹھ اہل ایمان کا دوسرا گروپ حبشہ روانہ ہوا، اس طرح ہجرت اولیٰ مکمل ہوئی اور کل تراسی اصحاب (بہ شمول عمار بن یاسر جن کا حبشہ جانا ثابت نہیں) حبشہ پہنچ گئے۔ کچھ عرصہ کے بعد تمام اہل مکہ کے ایمان لانے کی افواہ حبشہ پہنچی تو صحابہ کی ایک تعداد نے مکہ واپسی کا قصد کیا، حضرت عامر بن ربیعہ ان میں سے ایک تھے۔ مکہ کے قریب پہنچنے پر معلوم ہوا کہ جو خبر انھیں سنائی گئی تھی، جھوٹ تھی۔ تب کل تینتیس اصحاب چوری چھپے یا کسی مشرک کی پناہ لے کر مکہ میں مقیم ہو گئے۔ ان کی اکثریت نے یہیں سے مدینہ کو ہجرت کی تاہم کچھ افراد کو مشرکوں نے قید کر لیا۔ حضرت عامر بن ربیعہ بھی مکہ میں داخل ہو گئے، لیکن کسی کی پناہ نہ لی۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

حضرت عامر بن ربیعہ کی اہلیہ لیلیٰ بیان کرتی ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ہمارے حلیف عمر بن خطاب نے ہم پر بہت سختی کی۔ میں حبشہ جانے کے لیے اونٹ پر سوار تھی، عامر کسی کام سے نکلے تھے کہ عمر آ گئے اور مجھ سے پوچھا: ام عبداللہ، کہاں جا رہی ہو؟ میں نے جواب دیا: تم لوگوں نے ہمیں دین میں بہت ایذائیں دی ہیں، ہم اللہ کی اس سرزمین میں جا رہے ہیں جہاں اس کی بندگی کرنے پر ہمیں ایذا نہ پہنچائی جائے گی۔ مجھے عمر کے لہجے میں نرمی نظر آئی، انھوں نے کہا: ''اللہ تمھارے ساتھ رہے'' اور وہاں سے چل دیے۔ حضرت عامر آئے تو میں نے کہا: آپ نے عمر کی غیر معمولی نرمی تو دیکھی ہوتی۔ انھوں نے پوچھا: تمھیں توقع ہے کہ وہ اسلام قبول کر لیں گے؟ میں نے کہا: ہاں۔ عمر کی درشتی سے نالاں حضرت عامر نے کہا: واللہ، جب تک خطاب کا گدھا ایمان نہ لائے، وہ مسلمان نہ ہوں گے۔

بعثت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کے دسویں سال، حج کے موقع پر مدینۂ یثرب کے باسی اللہ کی توفیق سے اسلام کی طرف راغب ہوئے۔ حضرت ابوسلمہ اسی وقت مدینہ منتقل ہو گئے اور پہلے مہاجر ہونے کا شرف حاصل کیا۔ ۱۱ رنبوی میں بیعت عقبۂ اولیٰ کے بعد آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل ایمان کو مدینہ ہجرت کرنے کا اذن عام دے دیا، تب حضرت عامر بن ربیعہ، ان کی اہلیہ لیلیٰ، حضرت عبداللہ بن جحش، ان کی اہلیہ اور بھائی ابواحمد عبد بن جحش دار ہجرت پہنچے۔ خود ان سے روایت ہے کہ مجھ سے پہلے صرف ابوسلمہ بن عبدالاسد ہی مدینہ آئے تھے، البتہ حضرت عامر کی اہلیہ لیلیٰ بنت ابوحثمہ مدینہ پہنچنے والی پہلی خاتون تھیں۔ حضرت عامر، ابوسلمہ اور بنوجحش (جحش کا کنبہ) مدینہ کے مضافات قبا میں بنوعمرو بن عوف کے محلّہ میں مبشر بن عبدالمنذر کے ہاں مقیم ہوئے۔ حضرت مصعب بن عمیر، حضرت عثمان بن مظعون، حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ اور حضرت عمار بن یاسر بھی اسی زمانے میں وہاں منتقل ہوئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یزید بن منذر انصاری (عبادہ: ابن جوزی) سے حضرت عامر بن ربیعہ کی مواخات قائم فرمائی۔

۲ھ، جمادی الثانی یا رجب کے مہینے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کی سرگرمیوں کی خبر لینے کے لیے حضرت عبداللہ بن جحش کی سربراہی میں نو (واقدی کے مطابق بارہ) مہاجرین کا ایک سریہ روانہ کیا۔ حضرت عبداللہ کے علاوہ حضرت ابوحذیفہ بن عتبہ، حضرت عکاشہ بن محصن، حضرت عتبہ بن غزوان، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت واقد بن عبداللہ، حضرت خالد بن بکیر اور حضرت سہیل بن بیضا اس میں شامل تھے۔ یہ چھ اونٹوں پر سوار تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عبداللہ کو ایک خط دے کر فرمایا: مدینہ سے مکہ کی جانب دو دن کا سفر (اٹھائیس میل کی مسافت) طے کر لینے کے بعد وادئ ملل پہنچ کر اسے پڑھنا۔ آپ کی ہدایت کے مطابق انھوں نے

خط کھولا تو لکھا پایا: ''مکہ اور طائف کے بیچ واقع مقام نخلہ کی طرف سفر جاری رکھو، وہاں پہنچ کر قریش کی نگرانی کرو اور ان کے بارے میں معلومات حاصل کرو۔'' حضرت عبداللہ نے فرمان نبوی پر سمع وطاعت کہا اور ساتھیوں کو بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ کسی کو زبردستی آگے لے جاؤں۔ جو شہادت چاہتا ہے، چلے۔ سب چل پڑے، کوئی پیچھے نہ رہا۔ دستہ بحران کے مقام پر پہنچا تو عتبہ بن غزوان اور سعد کا مشترکہ اونٹ کھو گیا۔ دونوں اسے تلاش کرنے لگ گئے، ابن جحش باقی ساتھیوں کو لے کر چلتے رہے اور نخلہ پہنچ گئے۔ کشمش، کھالیں اور دوسرا سامان تجارت لے کر چار افراد پر مشتمل قریش کا قافلہ گزرا۔ عکاشہ نے سر منڈایا نہ ہوتا تو اہل قافلہ انھیں دیکھ کر خوف زدہ ہو جاتے، وہ مغالطہ میں رہے کہ مسلمان عمرہ کے لیے جا رہے ہیں۔ مسلمانوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اگر قافلے والوں کو آج کی رات چھوڑ دیا تو یہ حدود حرم میں داخل ہو کر مامون ہو جائیں گے اور اگر قتال کیا تو یہ حرام مہینے میں ہو گا۔ کچھ پس و پیش کے بعد انھوں نے حملے کا فیصلہ کیا۔ مشرک کھانا پکانے میں مصروف تھے، واقد بن عبداللہ نے تیر مار کر قافلے کے سردار عمرو بن حضرمی کو قتل کر دیا اور عثمان بن عبداللہ اور حکم بن کیسان کو قید کر لیا۔ نوفل بن عبداللہ فرار ہو گیا۔ ہجرت مدینہ کے بعد یہ ساتویں مہم اور پہلا سریہ تھا جس میں کامیابی ملی، عمرو عہد اسلامی کا پہلا قتیل اور عثمان اور حکم پہلے اسیر تھے۔ حضرت عبداللہ بن جحش نے تاریخ اسلامی میں حاصل ہونے والے پہلے مال غنیمت کی اپنے طور پر تقسیم کر کے ۱/۵ حصہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے رکھ لیا، حالاں کہ خمس کا حکم نازل نہ ہوا تھا۔ سریۂ عبداللہ بن جحش جنگ بدر کے وقوع کا سبب بنا، کیونکہ اس سے قریش کی معیشت کو سخت دھچکا لگا۔ ان کی تمام تر خوش حالی شام سے تجارت پر موقوف تھی، حبشہ اور یمن سے تجارت کا اتنا حجم نہ تھا کہ وہ اس پر انحصار کر لیتے۔ اس مہم کا دوسرا فائدہ یہ ہوا کہ قریش پر مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی عسکری قوت کا رعب بیٹھ گیا۔

حضرت عامر نے جنگ بدر، جنگ احد اور تمام غزوات میں حصہ لیا۔

حضرت عامر بن ربیعہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک سریہ میں عمرو بن سراقہ کو ہمارے ساتھ بھیجا۔ وہ دبلے اور طویل القامت تھے۔ بھوک سے ان کی کمر دہری ہونے لگی تو ہم نے ایک پتھر ان کے پیٹ پر باندھ دیا۔ مزید ایک دن کے سفر کے بعد کھانا ملا تو عمرو بولے: میں سمجھتا تھا کہ دو پاؤں پیٹ کو سہار سکتے ہیں، کیونکہ پیٹ بھی تو دو ٹانگوں کا بوجھ اٹھا لیتا ہے۔

حضرت عامر بن ربیعہ بتاتے ہیں کہ ایک سیاہ اندھیری رات میں ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سفر کیا۔ ہمیں معلوم نہیں تھا کہ قبلہ کس طرف ہے۔ ہر شخص نے اپنے اندازے سے قبلے کا رخ متعین کیا اور نماز پڑھ لی۔

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

صبح ہوئی تو ہم نے یہ معاملہ آپ کے گوش گزار کیا۔ تب اللہ کا فرمان نازل ہوا: 'وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ'، ''اللہ ہی کے ہیں مشرق و مغرب، تم جس طرف بھی منہ کرو اللہ کا رخ ہوگا''۔ (البقرہ ۲: ۱۱۵) (ترمذی، رقم ۳۴۵)۔ ترمذی نے یہ روایت بیان کر کے خود ہی اس کے راوی اشعث بن سعید کو ضعیف قرار دیا ہے۔ ابن ماجہ کی روایت مختلف ہے، حضرت عامر بن ربیعہ کہتے ہیں کہ ایک سفر میں ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے کہ آسمان ابر آلود ہو گیا اور ہمارے لیے قبلے کا تعین کرنا مشکل ہو گیا۔ ہم نے نماز پڑھ لی اور اپنے رخ کو نشان زد کر لیا۔ بادل چھٹ کر سورج نکلا تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہمارا رخ قبلے کی طرف نہ تھا۔ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا تو اللہ کا فرمان نازل ہوا: 'وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ' (ابن ماجہ، رقم ۱۰۲۰)۔ سنن ابن ماجہ کے محشّی محمود نصار نے اس حدیث کو حسن قرار دیا ہے۔

غزوۂ ذات سلاسل فتح مکہ سے پہلے ہوا۔ ۸ھ میں آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمرو بن عاص کی قیادت میں ایک فوج شام کی سرحد پر آباد قبیلے بنو بلی کی طرف بھیجی۔ دشمن کی تعداد زیادہ تھی، اس لیے حضرت عمرو نے کمک مانگی۔ آپ نے حضرت ابوعبیدہ بن جراح کی سربراہی میں ایک دستہ روانہ کیا، سیدنا ابوبکر و عمر بھی اس میں شامل تھے۔ پانسو سپاہیوں پر مشتمل اس مشترکہ فوج نے حضرت عمرو بن عاص کی کمان میں پورے علاقے میں گشت کیا تو دشمن کی فوج بکھر گئی۔ آخر کار سرحد کے قریب بنو بلی، بنو عذرہ اور بلقین (بنو قین) کی سپاہ سے ان کا سامنا ہوا۔ گھنٹا بھر کی جنگ میں خوب تیر اندازی ہوئی، اس کے بعد دشمن کو شکست ہوئی۔ ایک تیر جیش اسلامی میں شامل حضرت عامر بن ربیعہ کے بازو پر لگا اور وہ زخمی ہو گئے۔

ایک دفعہ حضرت عامر بن ربیعہ کا گزر دوسرے صحابی سہل بن حنیف پر ہوا۔ انھیں نہاتا دیکھ کر حضرت عامر پکارے: میں نے کسی کنواری لڑکی کی بھی جلد ایسی نہیں دیکھی جیسی آج تمھاری دیکھ لی ہے۔ کچھ دیر گزری تھی کہ سہل کو دورہ پڑا اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ انھیں فوراً نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے جایا گیا کہ سہل کو دیکھیں، وہ گرے پڑے ہیں۔ کیا تم سہل کو نظر لگانے کا الزام کسی کو دیتے ہو؟ آپ نے دریافت فرمایا۔ لوگوں نے حضرت عامر بن ربیعہ کا نام لیا۔ آپ نے (غصے سے) فرمایا: تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو نظر لگا کر کیوں مارتا ہے، اگر اس کی کوئی شے بھلی لگتی ہے تو اس میں برکت کی دعا کرے۔ پھر آپ نے پانی منگوا کر حضرت عامر کو اس سے وضو کرنے کو کہا۔ انھوں نے شرم گاہ دھوئی، منہ، کلائیوں تک ہاتھ اور گھٹنوں تک پاؤں دھوئے۔ آپ نے بقیہ پانی سہل پر ڈالنے کا حکم دیا (ابن ماجہ، رقم ۳۵۰۹)۔ یہی واقعہ امام مالک نے اپنی موطا میں دو روایات میں بیان کیا ہے۔ روایت ۱۶۹۰ چند الفاظ کی کمی بیشی

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کے ساتھ سنن ابن ماجہ کی روایت سے ملتی جلتی ہے۔ البتہ ’کتاب الجامع‘ (کتاب العین) میں درج یہ روایت مختلف متن رکھتی ہے۔ سہل بن حنیف کے بیٹے ابوامامہ بیان کرتے ہیں کہ میرے والد سہل مدینہ کے چشمہ خرار پر نہائے۔ انھوں نے اپنا جبہ اتارا ہی تھا کہ (وہاں پر موجود) حضرت عامر بن ربیعہ ان کے گورے چٹے خوب صورت جسم کو دیکھ کر بولے: میں نے آج جیسا منظر نہیں دیکھا۔ کنواری دوشیزہ کی جلد بھی اتنی نازک نہ ہوگی۔ سہل اسی وقت تکلیف (یا بخار) سے گر پڑے، ان کا الم (یا بخار) شدت پکڑ گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا۔ آپ وہاں پہنچے تو سہل نے حضرت عامر کی کہی بات سنائی۔ فرمایا: تم میں سے کوئی اپنے بھائی کو کیوں ہلاک کرتا ہے؟ اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کیوں نہیں کرتا؟ نظر لگنا حق ہے، سہل کے لیے وضو کرو۔ عامر بن ربیعہ نے وضو کیا تو سہل بن حنیف بھلے چنگے ہو کر رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چلے گئے، انھیں کوئی تکلیف نہ رہی تھی (موطا امام مالک، رقم ۱۶۸۹، احمد، رقم ۱۵۹۲۲)۔ مسند احمد کی روایت ۱۵۶۴۰ اس طرح ہے کہ حضرت عامر اور سہل دونوں نہانے کے لیے نکلے۔ حضرت عامر خود کہتے ہیں کہ میں نے سہل کو نظر لگا دی تو وہ دھڑام سے پانی میں گرے۔ انھوں نے میری پکار کا کوئی جواب نہ دیا تو میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو بلا لایا۔ آپ نے سہل کا سینہ ٹھونکا اور دعا فرمائی: اے اللہ، سہل سے نظر کی گرمی، سردی اور بیماری دور کر دے۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ”نظر لگنا حق ہے“ (بخاری، رقم ۵۷۴۰)۔ یعنی یہ ایک ثابت شدہ امر ہے۔ مسند احمد کی روایت میں تصریح ہے کہ شیطان نظر کے ذریعے آتا ہے اور اسی سے ابن آدم کا حسد ظاہر ہوتا ہے (احمد، رقم ۹۶۳۱)۔ صحیح مسلم کی روایت میں اضافہ ہے: ”اگر کوئی شے تقدیر کو پیچھے چھوڑنے والی ہوتی تو نظر ہوتی“ (رقم ۵۷۵۳)۔ ام المومنین ام سلمہ روایت کرتی ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے گھر میں ایک باندی دیکھی جس کے منہ پر چھائی تھی۔ آپ نے فرمایا: اسے دم کراؤ، اسے نظر لگ گئی ہے (بخاری، رقم ۵۷۳۹)۔ اس کے برعکس مضمون پر مشتمل صحیح بخاری ہی کی روایت ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: میں نے خواب میں ایک بڑا گروہ دیکھا جو افق پر چھا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ یہ آپ کی امت ہے، ان میں ستر ہزار افراد ایسے ہیں جو بغیر حساب کتاب کے جنت میں جائیں گے۔ پھر وضاحت فرمائی: یہ وہ لوگ ہیں جو بری فال لیتے نہ دغواتے نہ منتر کراتے تھے۔ یہ تو اپنے رب پر بھروسا کرتے تھے (رقم ۵۷۵۲)۔ طبری کا کہنا ہے کہ ایسا توکل وہی کر سکتا ہے جس کا دل خوف سے خالی ہو اور وہ موذی درندوں اور جانی دشمنوں سے بھی نہ ڈرتا ہو۔ ایک مومن کا یہی مقصود ہونا چاہیے، تاہم اسباب کا سہارا لینا ضروری امر اور سنت نبوی ہے (فتح الباری)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

علما کی اکثریت نے نظر بد کا بیان کرنے والی روایتوں کو من وعن قبول کیا ہے۔ مولانا امین احسن اصلاحی نے موطا امام مالک پڑھاتے ہوئے یہ تبصرہ کیا کہ نظر بد بھی اعمال سفلیہ کی طرح کی ایک چیز ہے۔ اس میں اتنی ہی تاثیر ہوتی ہے جتنی سحر میں ہوتی ہے۔ موطا امام مالک کی دونوں روایتوں میں ایک بڑا فرق یہ ہے کہ پہلی روایت کے راوی محمد بن ابی اسامہ، جبکہ دوسری محمد بن شہاب زہری سے مروی ہے۔ پہلی روایت کے مطابق نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عامر بن ربیعہ کو وضو کرنے اور سہل بن حنیف کے لیے برکت کی دعا کرنے کو کہا جس سے سہل اچھے ہو گئے۔ یہ بات قرین قیاس اور شریعت کے مزاج کے مطابق ہے۔ دوسری روایت میں ابن شہاب نے اس کو ایک ٹوٹکا بنا کر پیش کیا ہے۔ ان کے کہنے کے مطابق جس آدمی سے نظر بد لگی ہو، اس کو نہلایا جائے۔ تمام اعضا حتیٰ کہ زیر جامہ کے اعضا کو بھی دھو کر پانی ایک برتن میں جمع کیا جائے اور وہ تمام کا تمام مریض کے اوپر ڈالا جائے تو نظر بد کا اثر ختم ہو جائے گا اور مریض تندرست ہو جائے گا۔ یہ سب اوہام ہیں، ان کو حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ زہری کے مقاصد میں یہ بات بھی رہی ہے کہ یہود کے اعمال سفلیہ کو اسلام میں گھسایا جائے۔ ایمان بالجبت (اعمال سفلیہ پر ایمان) یہود کی خصوصیت رہی ہے۔ ٹونے ٹوٹکے وغیرہ سب جبت کے قبیل میں سے ہیں۔ روایت میں بیان کردہ غسل کے طریقہ کے لیے شاہ ولی اللہ نے بھی لکھا ہے کہ یہ ابن شہاب کی اپنی گرہ ہے۔ (تدبر حدیث) صحیح مسلم کی مندرجہ بالا روایت: ۵۷۵۳ میں یہ بھی ہے کہ (نظر اتارنے کے لیے) ''اگر تمھیں غسل کرنے کو کہا جائے تو غسل کرو۔'' گویا نظر بد کا سبب بننے والے کو اس حکم کو لازمی ماننا ہوگا۔ ابن حجر کا خیال ہے کہ نظر بد دور کرنے کے لیے غسل کرنا عربوں کے ہاں پہلے سے مروج تھا۔ محمود نصار کہتے ہیں کہ ہم سنن ابن ماجہ کی حدیث میں بیان کیے گئے نظر بد کو دور کرنے کے طریقہ کی وضاحت نہیں کر سکتے، کیونکہ یہ ان امور میں سے ہے جو عقل سے ماورا ہیں۔

بری نظر کا تصور ہر معاشرے میں رہا ہے۔ ایرانی اسے زخم چشم (یا چشم بد) کا نام دیتے ہیں، عرب 'العین الحسود' کہتے ہیں، انگریز evil eye اور اطالوی malocchio کے نام سے پکارتے ہیں۔ افلاطون کے مکتبۂ فکر سے تعلق رکھنے والے یونانی ادیب پلوٹارک (Plutarch) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ حاسد کے اندرون سے ایسی شعاعیں نکلتی ہیں جو زہر آلود برچھیوں کی طرح دوسرے پر اثر کرتی ہیں۔ اسکندر نے اپنی مہم جوئی کے دوران میں یہ اعتقاد مشرقی دنیا میں پہنچایا اور یورپی استعماری اسے امریکا لے گئے۔ حیرت ہے کہ یہی بات ابن قیم نے فرّاء کے حوالے سے لکھی اور کہا کہ نظر کے یہ تیر صرف ان لوگوں پر اثر نہیں کرتے جو متنبہ ہوتے ہیں اور انھوں نے روک کا کوئی بندوبست کر رکھا ہوتا ہے۔ انھوں نے نظر کی تاثیر ثابت کرنے کے لیے پرزور دلائل دیے اور ان لوگوں پر خوب برسے جو اس تاثیر

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

کو نہیں مانتے۔ ابن قیم کے دلائل یہ ہیں:

ارواح کی تاثیر اتصال جسمانی کے علاوہ محض آمنے سامنے ہونے سے، نظر کے ذریعے، دعاؤں اور تعویذوں سے یا وہم وخیال سے ہو سکتی ہے۔

حضرت ابوسعید خدری فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جنوں اور نظر لگنے سے پناہ مانگا کرتے تھے، یہاں تک کہ معوّذتین نازل ہوئیں۔ تب آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سورتوں کا ورد کرتے اور باقی اذکار کو ترک فرما دیا (ترمذی، رقم ۲۰۵۸)۔

جس طرح سانپ کی نظر سے انسان دہشت زدہ ہو جاتا ہے، اسی طرح ایک انسان کی دوسرے انسان پر نظر بھی اثر رکھتی ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: (عام) سانپوں، دودھاریاں رکھنے والے اور چھوٹی یا کٹی دم والے (خاص سانپوں) کو مار دو، کیونکہ یہ نگاہ زائل کر دیتے ہیں اور حمل گرا دیتے ہیں (بخاری، رقم ۳۲۹۷)

'وَاِنْ یَّکَادُ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لَیُزْلِقُوْنَکَ بِاَبْصَارِهِمْ لَمَّا سَمِعُوا الذِّکْرَ'، ''اور یہ کافر جب قرآن کی یاددہانیاں سنتے ہیں تو اس طرح آپ کو دیکھتے ہیں، گویا اپنی نگاہوں کے زور سے آپ کو ڈگمگا دیں گے'' (القلم ۶۸: ۵۱) (زاد المعاد)۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

دنیا بھر میں یہ نظریہ عام ہو گیا تو بری نظر سے محفوظ رہنے کے لیے تمام مذاہب کے حاملین نے طرح طرح کے تعویذ گنڈے اور نظر پٹو تخلیق کیے۔ طب کی تیس سالہ پریکٹس کے دوران میں ہم نے یہی تجربہ کیا کہ نظر بد انھی لوگوں پر اثر کرتی ہے جو نفسیاتی طور پر مغلوب ہوتے ہیں۔ کچھ لوگ خود پر، اپنے بچوں یا دھن دولت پر اتراتے ہیں۔ خودستائی کے بعد وہ اس وسوسے میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ کہیں یہ مال و اولاد ان سے چھن نہ جائے، پھر ہر آفت کو نظر بد سے منسوب کر دیتے ہیں۔ گویا labile psyche (کمزور شخصیت) نظر لگنے کے عمل میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جو لوگ عزم و اعتماد اور مضبوط شخصیت رکھتے ہیں، انھیں کوئی خاص اثر نہیں ہوتا۔

۱۶ھ میں بیت المقدس کا محاصرہ طول کھینچ گیا تو شہر والے اس شرط پر ہتھیار ڈالنے پر آمادہ ہوئے کہ خلیفۃ المسلمین سیدنا عمر بذات خود شہر کی کنجیاں وصول کریں اور معاہدۂ صلح پر خود دستخط کریں۔ حضرت عمر فاروق نے اہل رائے سے مشورہ کیا تو اکثریت نے ان کو خود جانے کا مشورہ دیا۔ وہ مدینہ سے ایک لشکر لے کر روانہ ہوئے، مقدمۂ جیش پر حضرت عباس بن عبدالمطلب کو مامور کیا، حضرت عثمان بن عفان، حضرت عامر بن ربیعہ، حضرت طلحہ بن عبیداللہ،

حضرت اسید بن حضیر، حضرت علقمہ بن مجزز لشکر میں شامل تھے۔ حضرت عامر نے امیر المومنین کا پرچم اٹھا رکھا تھا۔ شام کے شہر حوران کے قصبہ جابیہ پہنچے تو حضرت عمر نے اپنے کمانڈروں یزید بن ابوسفیان، خالد بن ولید اور ابوعبیدہ بن جراح سے صلاح مشورہ کیا۔ جابیہ میں بیت المقدس کے لاٹ پادری صفرنیوس کے ایلچی ان سے معاہدۂ صلح کرنے آئے۔ جابیہ ہی میں حضرت عمر نے اپنا مشہور خطبہ دیا جس میں اسلام کی بنیادی تعلیمات بتانے کے ساتھ تقدیر پر بحث کرنے سے سختی سے منع کر دیا (ترمذی، رقم ۲۱۶۵، ابن ماجہ، رقم ۲۳۶۳، احمد، رقم ۱۱۴)۔

خلیفۂ سوم سیدنا عثمان حج پر روانہ ہوئے تو حضرت عامر بن ربیعہ کو مدینہ کا قائم مقام حاکم مقرر کیا۔ عہد عثمانی کے اواخر میں فسادیوں نے حضرت عثمان پر طعن زنی شروع کی۔ حضرت عامر کے بیٹے عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں ایک رات حضرت عامر تہجد پڑھتے پڑھتے سو گئے۔ خواب میں ایک شخص نے کہا کہ اٹھ کر اللہ سے دعا مانگو کہ وہ تمھیں اس فتنہ میں پڑنے سے بچائے جس سے اس نے اپنے صالح بندوں کو محفوظ رکھا ہے۔ بیدار ہو کر انھوں نے نوافل مکمل کیے، انھی الفاظ میں دعا مانگی اور بیمار پڑ کر گھر میں مقید ہو گئے۔ اسی بیماری میں انھوں نے وفات پائی اور ان کا جنازہ ہی گھر سے نکلا۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

۳۳ھ یا ۳۷ھ میں حضرت عامر بن ربیعہ کا انتقال ہوا۔ ۳۱ھ اور ۳۲ھ کا سن بھی بیان کیا گیا ہے۔ واقدی کا کہنا ہے کہ وہ حضرت عثمان کی شہادت (۳۵ھ) کے کچھ دن بعد فوت ہوئے۔ اس زمانہ میں وہ گھر سے باہر نہ نکلتے تھے۔ جنازہ اٹھایا گیا تو ہی لوگوں کو ان کی بیماری کا علم ہوا۔ ابن حجر نے ۳۷ھ اور ذہبی نے ۳۵ھ کو درست سن وفات سمجھا ہے۔

ابونعیم اصفہانی نے ان الفاظ میں حضرت عامر بن ربیعہ کو خراج تحسین پیش کیا ہے کہ عامر عطیات میں کوئی رغبت نہ رکھتے تھے، وہ زمین اور جائیداد سے بے نیاز تھے۔ انھوں نے ذکر الٰہی سے مساجد اور تمام مقامات کو آباد رکھا۔ فتنوں میں مبتلا نہ ہوئے اور پاک دامنی کی زندگی بسر کی۔ عامر کی بے نیازی اور ان کے غنا کی وضاحت کرنے کے لیے اصفہانی نے یہ روایات بیان کیں: ایک رئیس نے انھیں قطعۂ زمین دینا چاہا تو جواب دیا کہ مجھے تمھاری اراضی کی کوئی حاجت نہیں۔ آج ہی ایک سورت نازل ہوئی ہے جس نے ہمیں دنیا سے بے پروا کر دیا ہے۔ 'اِقْتَرَبَ لِلنَّاسِ حِسَابُهُمْ وَهُمْ فِيْ غَفْلَةٍ مُّعْرِضُوْنَ'، ''لوگوں کے حساب کا وقت قریب آ گیا ہے اور وہ غفلت میں منہ موڑے جا رہے ہیں'' (الانبیاء ۲۱:۱)۔ حضرت عامر کے بیٹے عبداللہ نے حضرت عامر کی زبانی بتایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہمیں کسی سریہ میں بھیجتے تو کھجوروں کے ایک تھیلے کے علاوہ کچھ نہ دیتے۔ امیر سریہ ہمیں ایک ایک مٹھی دے دیتا۔ وقت گزرنے کے ساتھ کھجوروں کی تعداد کم ہوتی جاتی حتیٰ کہ ایک وقت میں ایک کھجور پر گزارا کرنا پڑتا۔

عبداللہ نے پوچھا: ایک کھجور سے کیا بنتا ہے؟ یہ کم نہیں ہوتی بچے، حضرت عامر نے جواب دیا: ایسا بھی ہوتا کہ ہمارے پاس یہ ایک کھجور بھی نہ ہوتی، اس لیے ہم اسی پر قناعت کرنے لگے (احمد، رقم ۱۵۶۳۲)۔

حضرت عامر بن ربیعہ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم، سیدنا ابوبکر اور سیدنا عمر سے حدیث روایت کی ہے۔ ان سے روایت کرنے والے ہیں، ان کے بیٹے حضرت عبداللہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت عبداللہ بن زبیر اور حضرت ابوامامہ بن سہل۔ حضرت عامر بن ربیعہ کی بیان کردہ چند روایات: حضرت عامر بیان کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ اونٹنی پر بیٹھے سر کے اشارے سے نوافل پڑھ رہے تھے۔ جدھر کو سواری جاتی، آپ کا رخ ادھر ہی ہوتا۔ فرض نمازیں آپ اس طرح ادا نہ فرماتے تھے (بخاری، رقم ۱۰۹۷، احمد، رقم ۱۵۶۳۵)۔ دوسری روایت میں حضرت عامر کہتے ہیں کہ اونٹنی کا یہ سفر جس میں آپ نے کجاوے پر بیٹھ کر نوافل ادا کیے، رات کے وقت ہوا (بخاری، رقم ۱۱۰۴، مسلم، رقم ۱۵۶۵)۔ حضرت عامر نے یہ فرمان نبوی بھی روایت کیا ہے: ''تم میں سے کوئی جنازہ جاتا دیکھے اور اس کے ساتھ چل نہ سکتا ہو تو اپنی جگہ پر کھڑا ہو جائے اور اس وقت تک کھڑا رہے جب تک جنازہ آگے نہ گزر جائے'' (بخاری، رقم ۱۳۰۸، مسلم، رقم ۲۱۷۶)۔ فرمان نبوی کا باقی حصہ حضرت عامر ہی کی روایت کردہ اگلی روایت میں مذکور ہے: ''جو جنازے کے ساتھ جائے، اس وقت تک نہ بیٹھے جب تک جنازہ زمین پر نہ رکھ دیا جائے۔'' (بخاری، رقم ۱۳۱۰)۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

مطالعۂ مزید: السیرۃ النبویۃ (ابن ہشام)، الطبقات الکبریٰ (ابن سعد)، تاریخ الامم والملوک (طبری)، الجامع المسند الصحیح (بخاری، شرکۃ دارالارقم)، حلیۃ الاولیاء وطبقات الاصفیاء (ابونُعیم اصفہانی)، المنتظم فی تواریخ الملوک والامم (ابن جوزی)، الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب (ابن عبدالبر)، اسد الغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ (ابن اثیر)، الکامل فی التاریخ (ابن اثیر)، البدایۃ والنہایۃ (ابن کثیر)، تاریخ الاسلام (ذہبی)، زاد المعاد (ابن قیم)، کتاب العبر ودیوان المبتداء والخبر (ابن خلدون)، الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ (ابن حجر)، حیاۃ الصحابۃ (محمد یوسف کاندھلوی)، تدبر حدیث، موطا امام مالک (امین احسن اصلاحی)، Evil eye (Wikipedia)۔

رضوان اللہ

# قوّامیت کے وجوہ

نکاح اصل میں خاندان کا ادارہ وجود میں لانے کا اعلان ہے اور اس ادارے کا ایک 'قوام'، یعنی سربراہ ہونا بھی بے حد ضروری ہے اور قرآن کے مطابق وہ مرد ہی ہے۔ 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ وَّبِمَآ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ' کے دو فقروں میں اب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ مرد ہی کیوں ہے۔ یہ فقرے مرد کی قوامیت کے وجوہ بیان کرنے کے لیے آئے ہیں، اس بات کی دلیل ان دونوں کے شروع میں حرف 'ب' کا آنا ہے۔ یہ اصطلاح میں سبب کی 'ب' کہلاتی اور کسی بات کی وجہ بیان کرنے کے لیے آیا کرتی ہے۔ یعنی آیت کے اس حصے کا مطلب یہ ہوگا کہ مرد میں قوامیت کی استعداد دوسرے فریق سے زیادہ پائی جاتی ہے اور مالی ذمہ داریوں کا بوجھ بھی چونکہ اسی کے اوپر لادا گیا ہے۔ چنانچہ ان دو وجوہات کی بنا پر اسے قوام بنایا گیا ہے۔ ان دونوں وجوہات کو ہم ذیل میں ذرا تفصیل سے بیان کرتے ہیں:

## وجہ اول

زیر بحث آیت کا یہ فقرہ ــــ اس لیے کہ اللہ نے ایک کو دوسرے پر فضیلت بخشی ہے ــــ مرد کو قوام بنائے جانے کی پہلی وجہ کو بیان کرتا ہے۔ قرآن کے اسالیبِ برہان سے واقف ہر شخص اس کو پڑھتے ہی یہ جان لیتا ہے کہ اس میں مرد یا عورت کی کلی فضیلت کا نہیں، بلکہ جزئی فضیلت کا بیان ہوا ہے، اس لیے کہ اس میں یہ نہیں کہا گیا کہ ہم نے مرد یا عورت کو فضیلت دی ہے، بلکہ 'بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ' کے الفاظ میں ان دونوں کی ایک دوسرے پر فضیلت

کا ذکر کیا گیا ہے۔ لہٰذا یہ طے ہے کہ اس فقرے کی بنیاد پر کسی کو یہ حق نہیں کہ وہ فریقین میں سے کسی ایک کو، بالخصوص مرد کو، مطلق طور پر برتر اور فائق تصور کرے اور پھر اسی بنیاد پر عورتوں کا استحصال بھی کیا کرے۔

کچھ لوگوں کی طرف سے یہاں ایک سوال اٹھایا گیا ہے، وہ یہ کہ 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ' میں کلی کے بجائے جزئی فضیلت ہی سہی، مگر اس بات کی کیا دلیل ہے کہ اس میں صرف اور صرف مرد کی فضیلت کا بیان ہوا ہے؟ اس لیے کہ یہ ایک عمومی اسلوب ہے اور اس میں بظاہر ایسا کوئی لفظ بھی موجود نہیں جو مرد و زن میں سے کسی ایک پر صریح طور پر دلالت کرتا ہو۔

اس سوال کے جواب میں پہلی بات تو یہ سامنے رہے کہ یہ فقرہ، جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، مرد کی قوامیت کی دلیل میں آیا ہے، اس لیے اس عمومی اور بظاہر مبہم فقرے کا یہ سیاق ہی اس کے عموم میں تخصیص اور اس کے اِبہام میں وضوح پیدا کر دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ اس پر 'بِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ' کا ایک اور فقرہ عطف ہوا ہے جو اپنے معنی اور اپنے ضمائر کی وجہ سے بالکل واضح ہے کہ اس میں مردوں ہی کے انفاق کا بیان ہے۔ سواُس سیاق کے ساتھ ساتھ یہ سباق بھی اس بات کی دلیل ہو جاتا ہے کہ معطوف علیہ فقرے میں بھی صرف مردوں ہی کی فضیلت کا بیان ہوا ہے۔

تاہم یہاں ایک اور سوال پیدا کیا جا سکتا ہے، وہ یہ کہ مرد کی قوامیت کی دلیل میں سیدھی طرح یہ کہہ دینے کے بجائے کہ مرد کو اللہ نے عورت پر فضیلت دی ہے، عموم کا اسلوب اور ابہام کا یہ انداز آخر کیوں اختیار کیا گیا ہے؟ اس سوال کا جواب یوں ہے کہ اس مقام پر فضیلت کے بیان کی تین ممکنہ صورتیں ہو سکتی تھیں:

ا۔ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، اس لیے کہ اللہ نے عورت کو مرد پر فضیلت دی ہے۔

ب۔ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، اس لیے کہ اللہ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔

ج۔ مرد عورتوں کے سربراہ ہیں، اس لیے کہ اللہ نے دونوں کو ایک دوسرے پر فضیلت دی ہے۔

ظاہر ہے، ان میں سے پہلی صورت کا استعمال کیا جانا تو کسی طرح بھی روا نہیں ہے، اس لیے کہ جب مرد کو سربراہ کہہ دیا گیا تو اس کی دلیل میں عورت کی برتری کو بیان کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔ رہی دوسری صورت، تو وہ قیاس اور عقل کے عین مطابق ہے، اس لیے کہ جب مرد کی سربراہی کا اعلان ہو تو اس کی دلیل میں مرد ہی کی فضیلت کو بیان کرنا، انتہائی معقول اور قابل فہم نظر آتا ہے۔ سو قرآن میں پائی جانے والی حکمت بھی اگر آسمان پر بننے کے بجائے زمین پر اور پھر منطق کے اصولوں پر بنی ہوتی، تو اس میں بھی ضرور اِسی دوسری صورت کو اختیار کیا جاتا، لیکن اس نے قیاس پر مبنی اور منطق بھرے اس اسلوب کو بھی چھوڑا اور 'بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ' کی تیسری صورت کو اختیار کیا۔ اِس

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

نے اُسے کیوں چھوڑا اور اِسے کیوں اختیار کیا؟ ہمارے نزدیک اس احتراز و انتخاب کی وجہ بڑی سادہ سی ہے۔ 'قوّام علیٰ' کا مطلب چونکہ منتظم اور سربراہ ہو جانا ہے، اس لیے 'اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ' کا جملہ شوہر کو حاصل ایک طرح کی بالا دستی کا اظہار ہے۔ اس سے کسی کا اس گمان میں مبتلا ہو جانا عین ممکن تھا کہ شوہر کی یہ قوامیت، اصل میں اس کی مطلق برتری کی دلیل ہے۔ اس کے بعد اگر یہ بھی کہہ دیا جاتا کہ ہم نے اس کو عورت پر فضیلت دے رکھی ہے تو یہ جملہ اس مزعومہ برتری پر مہر تصدیق ثبت کر دیتا، حالاں کہ اس طرح کی کوئی برتری مرد کو بالکل بھی حاصل نہیں ہے۔ چنانچہ یہاں کوئی ایسا فقرہ لانا ہی موزوں ہو سکتا تھا جو اس غلط فہمی کا ازالہ کرتا[1] اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بات بھی بتا دیتا کہ خاندان کے مخصوص دائرے میں مرد کو عورت پر جو بالا دستی دی گئی ہے، اس کا جواز اسی لیے تو ہے کہ یہ دونوں اصول میں بہر حال ایک دوسرے پر فضیلت رکھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ یہ ساری بات 'بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ' کے عمومی اسلوب کو چھوڑ کر کسی اور طرح سے کہہ دینا ممکن ہی نہیں ہے۔

یہ واضح ہو جانے کے بعد کہ 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ' کا جملہ کلی نہیں، بلکہ جزئی فضیلت کا بیان ہے۔ نیز مرد اور عورت دونوں کی نہیں، بلکہ صرف اور صرف مرد کی فضیلت کا بیان ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مرد کو قوام بنا دینے والی اس فضیلت کی نوعیت کیا ہے؟ اس کی نوعیت معلوم کرنے کے لیے دو باتوں کی طرف توجہ رہنی چاہیے: ایک یہ کہ اس فقرے میں فعل کی نسبت اللہ کی طرف ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ یہ ایسی فضیلت ہے جو خالص وہبی ہے اور مرد کو مرد ہونے کی بنیاد پر ہی دی گئی ہے[2]۔ دوسرے یہ کہ یہاں اسی فضیلت کی بنیاد پر گھر کی سربراہی دی گئی ہے، اس لیے لازم ہے کہ یہ ایسی صلاحیت ہو جو ایک خاندان کو چلانے کے لیے بنیادی اہلیت کی حیثیت رکھتی ہو[3]۔ یہ دونوں باتیں ملحوظ رہیں تو اب آسانی سے متعین ہو جاتا ہے کہ 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی بَعْضٍ' میں

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

---

[1] ممکنہ غلط فہمیوں کو رفع کرنے کا یہ انداز، قرآن مجید کا عام طریقہ ہے۔ سورۂ بقرہ (۲) کی آیت ۲۲۸ میں ہے: 'وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ' کہ مردوں کے لیے عورتوں پر ایک درجہ ترجیح کا ہے۔ یہ ترجمہ 'دَرَجَةٌ' کی تنوین کو تنکیر کی تنوین سمجھ کر کیا گیا ہے۔ ہو سکتا تھا کوئی دوسرا اسی کو تفخیم کی تنوین مان کر اس کا ترجمہ 'بہت بڑا درجہ' کرتا اور اس طرح مرد صاحب کو جا عرش پر بٹھاتا۔ لیکن قرآن نے اس متوقع احتمال کو 'وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ' کہہ کر یک سر مسترد کر دیا ہے۔ اس لحاظ سے اس آیت اور زیر بحث آیت میں صرف ایک فرق ہے، یعنی سورۂ بقرہ میں ممکنہ شبہے کا رد پہلے اور سورۂ نساء میں یہی عمل بعد میں کیا گیا ہے۔

[2] چنانچہ یہاں اس نکتہ آفرینی کا کوئی جواز نہیں رہ جاتا جس کے مطابق عورت اگر کسی معاشرے میں اتنی فعال ہو جائے کہ مردوں کے سے اوصاف اپنے اندر پیدا کر لے تو وہاں مرد کے بجائے اسے ہی قوام ہونا چاہیے۔

[3] بالکل اسی طرح، جیسے ریاست کے سربراہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ریاستی امور انجام دینے کی بنیادی صلاحیت رکھتا ہو۔

دراصل، اس فضیلت کا بیان ہوا ہے جسے پروردگار عالم نے پیدایشی طور پر مردوں کو ودیعت کیا ہے اور ظاہر ہے، وہ وہی ہے جسے ہم مدافعت اور کسب معاش کی صلاحیت کا نام دیتے ہیں۔

اس مقام پر دو مخالف نکتہ ہاے نظر کے ہاں دو متضاد قسم کے سوال پیدا ہوتے ہیں: ایک یہ کہ اس فضیلت کو مدافعت اور کسب معاش کی صلاحیت ہی میں محدود کیوں کر دیا جائے، یہ ذہنی و نفسیاتی صلاحیت کو بھی محیط کیوں نہیں ہے؟ دوسرا یہ کہ یہ دونوں صلاحیتیں اگر مرد میں پائی جاتی ہیں تو عورت بھی ان سے محروم نہیں، وہ بھی محافظت اور معاشی سرگرمیاں انجام دے لینے پر قادر ہے۔ چنانچہ ان اوصاف کی بنیاد پر جو دونوں میں مشترک ہیں، صرف مرد ہی کو قوام کیوں بنایا جائے؟

پہلی بات کے جواب میں یاد رہے کہ یہاں بحث یہ نہیں ہو رہی کہ مرد و زن میں کیا کیا صلاحیتیں پائی جاتی ہیں یا کن کن باتوں میں یہ ایک دوسرے پر ترجیح رکھتے ہیں، بلکہ بحث اس میں ہے کہ وہ کون سی صلاحیت ہے جو خاندان کے سربراہ کے اندر ہونی چاہیے۔ لہٰذا، عقلی اور مزاجی یا پھر نفسیاتی خصائل کا ذکر چھیڑ دینے کا یہاں کوئی محل نہیں ہے۔ یہاں تو انھی اوصاف کا ذکر ہوگا جو روزِ اول سے آج تک گھر بار کو چلانے کے لیے ضروری رہے ہیں۔ اور اس بات میں کوئی شک نہیں کہ وہ صرف دو ہی ہیں: ایک مدافعت کی قوت اور دوسری کسب معاش کی استعداد۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

جہاں تک دوسری بات ہے کہ مرد و زن ان صلاحیتوں میں برابر ہیں تو یہ ایک بہت بڑا فکری مغالطہ ہے۔ یہ صلاحیتیں اصل میں مرد ہی کا خاصہ ہیں اور عورت کا ان میں سے اگر کچھ حصہ ہے بھی تو وہ اس کے مقابلے میں کم تر اور انتہائی ناقص ہے۔ یہ صلاحیتیں اُس وقت بھی اصلاً مرد ہی میں پائی جاتی تھیں، جب عورت گھر بار کو دیکھا کرتی اور یہ روزی روٹی کے لیے جنگلوں کی خاک چھانتا پھرتا تھا یا کسی موذی جانور کے خوف سے جب یہ اس کی اوٹ میں چھپ جاتی تو وہ اس خطرے سے اس کی حفاظت کیا کرتا تھا[۴]۔ آج بھی جبکہ ویرانے رہے نہ اس سے متعلق خطرات، معاش کی کم یابی اور اس کی سختیاں بھی نہ رہیں، یہ دونوں صلاحیتیں اپنی کامل صورت میں اسی میں پائی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس، عورت کی حیثیت جس طرح معاشی سرگرمیوں میں ایک مستقل عامل کی نہیں، بلکہ مرد کے ایک معاون ہی کی رہی ہے، اسی طرح مدافعت کی استعداد بھی اس میں بس اسی حد تک ہے کہ اپنی حفاظت کا کچھ نہ کچھ انتظام کر لے، وگرنہ جہاں تک کسی مرد یا پھر پورے خاندان کو تحفظ دینے کی بات ہے تو اس سے یہ بالکل ہی قاصر ہے۔ رہی جدید دنیا

---

[۴] مشہور عرب شاعر، عمرو بن کلثوم کے زمانے میں بھی یہ حقیقت اسی طرح موجود تھی۔ اس کے ایک شعر میں عورتیں اپنے مردوں کو یہ کہہ کر جنگ پر ابھارتی ہیں: 'ویقلن لستم بعولتنا ان لم تمنعونا' ''جو حفاظت ہماری نہ کر سکو تم، شوہر ہمارے پھر نہیں ہو تم۔''

کہ جس میں اپنی حفاظت کے لیے اب یہ کسی کی محتاج نہیں رہی اور معاش کا سارا انتظام خود سے کر سکنے پر قادر ہو گئی ہے تو اس کی وجہ بھی اس کے ذاتی خصائل نہیں، بلکہ مرد کے بجاے ریاست کی فراہم کردہ حفاظت اور اسی کے پیدا کردہ معاشی مواقع ہیں[۵]۔ غرض یہ کہ مذکورہ صلاحیتوں میں عورت مرد کے برابر ہرگز نہیں ہے کہ اس برابری کی بنیاد پر اس کی قوامیت کا بھی کسی حد تک امکان پیدا کیا جا سکے۔

اس بحث کے آخر میں ہم یہ بھی عرض کریں کہ مرد کی ان صلاحیتوں پر کوئی چیں بجبیں ہو یا اس بنیاد پر وہ خدا پر ظلم اور عدم مساوات کا الزام دھرے، جذباتی ماحول میں اس سے کچھ فائدہ ہو تو ہو، علمی دنیا میں اس سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ علم کی دنیا کو جذبات سے کام نہیں، اس کو تو حقائق سے واسطہ ہے۔ اور یہاں بھی چند حقائق ہی ہیں جو ان معترضین کی نظروں سے اوجھل ہو گئے ہیں:

پہلا یہ کہ خدا نے اگر مرد کو کچھ صلاحیتیں دی ہیں تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں کہ اس نے عورت کو یک سر محروم رکھا ہے، بلکہ کسی وصف میں اس نے مرد کو فضیلت دی ہے تو کئی اوصاف ایسے بھی ہیں جن میں عورت کو واضح طور پر برتری کی جگہ دی ہے۔ مثال کے طور پر، مرد کو اگر زورِ بازو دیا، محافظت کی صلاحیت اور کسب کی طاقت دی ہے تو عورت کو مودّت دی، پیار اور محبت دی، ممتا اور شفقت دی، انسان کو وجود میں لانے اور پھر اس کو واقعی انسان بنا دینے تک کا حوصلہ اور طاقت دی ہے۔ اول الذکر صلاحیتیں، اگر مرد کو ملتی اور اسے قوّام بنا دیتی ہیں تو ثانی الذکر جب عورت کو مل جاتی تو اسے ماں بنا دیتی اور اس طرح مرد پر اسے حاکم حتیٰ کہ اس کی جنت کا سامان بنا دیتی ہیں۔ سو اس حقیقت پر ہماری نگاہ رہے کہ پروردگار عالم کسی ایک کا نہیں، عورت و مرد دونوں کا خالق ہے، اس لیے کسی پر اس نے زیادتی کی نہ کوئی ظلم کیا، بلکہ ہر ایک کو اپنی جناب سے دیا اور بے حد و حساب دیا ہے۔

دوسرے یہ کہ مرد و زن میں سے کس کو کیا دیا ہے، یہ کوئی الل ٹپ فیصلہ نہیں ہوا۔ اس تقسیم کی بنیاد اصل میں ان دونوں میں پائی جانے والی حیاتیاتی تفریق ہوئی[۶]۔ یہ دونوں اپنی جنس میں انسان ہیں، مگر اپنی نوع میں بہرحال مختلف

---

۵۔ ریاست اور بالخصوص فلاحی ریاست، یہ جس طرح ماضی میں ہر جگہ موجود نہیں رہی، اسی طرح حال میں بھی بہت سی جگہوں پر اس کا وجود ناپید ہے۔ لہٰذا اس پر خاندان کے اُس ادارے کی حفاظت اور کفالت کس طرح چھوڑی جا سکتی ہے جو انسانی فطرت کا ازلی و ابدی تقاضا ہے اور جسے ہر حال میں اور ہر مقام پر قائم ہو کر رہنا ہے۔ سو ضروری ہے کہ خاندان کی ان ناگزیر ضرورتوں کا مستقل انتظام ہو اور اس کا مسئول اس شخص کو بنایا جائے جو اس کی فطری صلاحیت رکھتا ہو اور زمان و مکان اور حالات و احوال سے وہ قطعی طور پر بے نیاز بھی ہو۔

۶۔ یہاں ضمناً یہ بات بھی سامنے رہے کہ حیاتیاتی تفریق پر مبنی خصائل جس طرح مستقل نوعیت رکھتے ہیں، اسی طرح ان پر مبنی

ہیں۔ اب مختلف انواع کو ایک جیسی صلاحیتیں دے دینا، اس کائنات کے مزاج کے لحاظ سے ایک کارِ بے حکمت ہوتا، چنانچہ خداے حکیم نے ان دونوں کو باہم ممتاز خصائل عطا کیے۔ مرد کو فاعلی قوتیں دیں تو عورت کو انفعالی قوتوں سے نوازا کہ ان دونوں کے امتزاج ہی سے وہ حسن اور اعتدال پیدا ہوتا ہے جو اس کائنات کے ذرے ذرے سے نمایاں ہے اور اس کی مقصدیت کے پہلو سے حددرجہ مطلوب بھی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ ہماری کوششیں مردوزن کے امتیازی خصائل اور ان کی حکمتوں کو سمجھنے کے لیے ہونی چاہییں نہ کہ ان سے بے پروا ہو جانے، بلکہ ان پر معترض ہو جانے کے لیے۔

تیسرے یہ کہ خدا کی طرف سے دی گئی ہر فضیلت، دراصل ہماری آزمایش کے لیے ہے۔ مان بھی لیں کہ مرد کو کچھ زیادہ ملا ہے اور عورت کو اس کی نسبت سے کچھ کم، مگر حقیقت یہی ہے کہ اسی میں دونوں کا امتحان ہے۔ خدا چاہتا ہے کہ یہ دونوں ایک دوسرے کی فطری خصوصیات کی آرزو کریں اور نہ انھیں ہدف بنا کر آپس میں کوئی محاذ آرائی کریں، بلکہ مرد کو جو کچھ ملا، وہ اس کے مطابق اور عورت کو جو کچھ ملا، وہ اس کے مطابق، اپنا میدان عمل بنائیں اور اسی میں اپنے سب جوہر دکھائیں اور اس طرح اپنے امتحان میں کامیابی کے مواقع پیدا کریں۔ اس معتدل رویے کو اپنانے میں شاید کبھی غلطی نہ ہوتی اگر زیر بحث آیت سے پہلے اس کی تمہیدی آیت کو بھی ٹھیک طرح سے دیکھ لیا جاتا۔ اس میں واضح طور پر ارشاد ہوا ہے: ''اور جو کچھ اللہ نے تم میں سے ایک کو دوسرے پر ترجیح دی ہے، اس کی تمنا نہ کرو، (اس لیے کہ) مردوں نے جو کچھ کمایا ہے، اس کا حصہ انھیں مل جائے گا اور عورتوں نے جو کچھ کمایا ہے، اس کا حصہ انھیں بھی لازماً مل جائے گا۔ (ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی تمنا ہو تو اس میدان میں آگے بڑھو) اور (اس کے لیے) اللہ سے اس کے فضل کا حصہ مانگو۔ یقیناً اللہ ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔[7]''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## وجہ دوم

زیر بحث آیت کا یہ فقرہ ـــــ 'وَبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ' (اور اس لیے کہ انھوں نے اپنے مال خرچ کیے ہیں) ـــــ مرد کی قوامیت کی دوسری وجہ کو بیان کرتا ہے۔ اس میں انفاق سے مراد کسی اور پر نہیں، بلکہ مردوں کا اپنی بیویوں پر خرچ کرنا ہے، اس لیے کہ مردوں کی انھی پر قوامیت کی دلیل میں اس کا ذکر آیا ہے۔ مزید یہ کہ اس خرچ سے مراد ایک آدھ مرتبہ خرچ کرنا بھی نہیں، اس لیے کہ 'اَنْفَقُوْا' کا جو فعل ماضی ہے، وہ یہاں بیان واقعہ کے بجاے بیان عادت

کردار بھی کبھی نہیں بدلتے۔ چنانچہ مرد کو اگر انھی کی بنیاد پر قوام بنایا گیا ہے تو اسے قوام ہی رہنا ہے، قطع نظر اس سے کہ زمانہ کتنے اوراق الٹ چکا اور حالات کتنی ہی کروٹیں لے چکے۔

[7] النساء ۴: ۳۲۔

کے لیے آیا ہے۔ مدعا یہ ہے کہ شوہروں کو بیویوں پر قوام بنانے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ وہ مستقل طور پر ان پر خرچ کرتے ،یعنی ان کے مالی کفیل ہوتے ہیں۔

بعض حضرات نے قوامیت کی بحث کی طرح یہاں بھی یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ اس آیت میں عرب معاشرے اور اس کے رواج کی رعایت ہے۔ وہاں چونکہ مرد ہی کماتے اور وہی خرچ کرتے تھے، اس لیے انھی کے انفاق کا ذکر ہوا اور اس پر مبنی انھی کی قوامیت کا حکم قرآن نے دیا۔ لیکن آج کے زمانے میں جبکہ عورت بھی مرد ہی کی طرح کماتی اور اپنے گھر میں خرچ کرتی ہے تو کیا یہ ضروری ہے کہ پھر بھی مرد ہی کو اس پر قوام بنایا جائے؟ بلکہ اگر کہیں صرف عورت ہی کماتی ہو تو پھر آگے بڑھ کر اسے ہی قوام کیوں نہ بنا دیا جائے؟ اس نکتہ آفرینی اور اس پر مبنی ان سوالات کے جواب میں اگرچہ وہی دلائل کافی ہیں جو قوامیت کی بحث کے ذیل میں گزرے، تاہم چند باتیں مزید بھی اس ضمن میں کہی جا سکتی ہیں:

پہلی یہ کہ اگر یہی بات کہنا قرآن مجید کے پیش نظر ہوتا تو اس کے لیے زیادہ موزوں الفاظ 'و بما ینفقون من اموالھم' کے ہوتے۔ یعنی مضارع کا فعل لایا جاتا جو حال کا واضح طور پر فائدہ دیتا اور ہمیں بتاتا کہ اس وقت مردوں کو عورتوں پر قوام اس لیے بنا دیا گیا ہے کہ وہ ان پر اپنے مال خرچ کر رہے ہیں۔ لیکن یہاں مضارع کے بجائے 'اَنۡفَقُوۡا' کا فعلِ ماضی استعمال ہوا۔ یہ فعل جس طرح ان حضرات کے استدلال کو احتمال کے درجے میں لے گیا، اسی طرح ایک دوسری بات کا احتمال بھی اس نے پیدا کر دیا کہ مردوں کا یہ انفاق نہ عارضی ہے نہ عرب معاشرے کے ساتھ خاص کسی قسم کی روایت ہے، بلکہ ایک دائمی اور ابدی نوعیت کا رواج ہے۔ اور یہ احتمال اُس وقت محض احتمال نہیں، ایک متعین اور حتمی بات ہو گیا جب 'وَبِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ' کا یہ فقرہ 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ' پر عطف ہوا۔ اس عطف نے واضح کر دیا کہ جس طرح مردوں کو مخصوص دائرے میں ایک فطری اور مستقل نوعیت کی فضیلت حاصل ہے، اسی طرح ان کا عورتوں پر خرچ کرنا بھی انسانی تاریخ کا ایک مستقل اور مسلسل عمل ہے، اس لیے کہ یہ انفاق، دراصل ان کی اسی صلاحیت کا ظہور ہے جس میں انھیں دوسروں پر فضیلت حاصل ہے۔ غرض یہ کہ فعل ماضی کا استعمال اور 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعۡضَهُمۡ عَلٰی بَعۡضٍ' پر اس کا عطف، یہ دونوں چیزیں آخری درجے میں واضح کر دیتی ہیں کہ 'وَبِمَاۤ اَنۡفَقُوۡا مِنۡ اَمۡوَالِهِمۡ' کے الفاظ میں کسی وقتی عمل یا کسی علاقائی رواج کی نہیں، بلکہ مردوں کے ایک مستقل وصف اور ان کی مسلسل تاریخ کی خبر دی گئی ہے۔ دوسرے لفظوں میں پوری بات یوں ہے کہ مردوں کو قوام اس لیے بنایا گیا ہے کہ وہ بیویوں کے مالی کفیل ہیں، اور یہ ذمہ داری ہمیشہ سے مردوں ہی نے اٹھائی ہے کہ اس کو اٹھانے

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کی فطری صلاحیت دراصل موجود بھی انھی میں ہے۔[8]

عورت اگر آج کماتی اور گھر میں خرچ کرتی ہے تو وہ یہ سب کچھ کس حیثیت سے کرتی ہے، یہ وہ دوسری بات ہے جو اس ضمن میں واضح رہنی چاہیے۔ کیا یہ نکاح کے بعد اس پر عائد ہونے والی ایک ذمہ داری ہے کہ جسے ہر حال میں نبھانا اس پر لازم ہے، حتیٰ کہ اس کے شوہر اور خاندان کا حق ہے کہ وہ اس بنیاد پر عدالت تک میں جا سکیں یا پھر یہ محض تعاون کی ایک صورت ہے جو ایک فرد خاندان کے دوسرے فرد کے ساتھ رضا کارانہ کیا کرتا ہے؟ ظاہر ہے، یہ تعاون ہی ہے اور اسی طرح کا تعاون ہے جو کوئی بھی شہری اپنے حکمران سے اور کوئی بھی ملازم اپنے کاروباری سربراہ سے بھی کرسکتا ہے اور جس کی وجہ سے حکمران کا حق حکومت ختم ہو جاتا ہے اور نہ سربراہ کا حق سربراہی چھین لیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا بیوی کے مالی تعاون کو اس بات کی دلیل سمجھ لینا کہ شوہر اب اس کا قوام نہیں رہا، یہ کسی بھی صورت میں صحیح طرز نہیں ہے۔

تیسری بات یہ کہی جاسکتی ہے کہ اگر شوہر کسی بھی وجہ سے نان ونفقہ نہیں دے پاتا اور اس کی جگہ عورت اس ذمہ داری کو ادا کرتی ہے تو اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ اب عورت مرد پر قوام ہو جائے گی۔ جس طرح، مثال کے طور پر، اگر حکمران روٹی کپڑا اور مکان جیسی بنیادی سہولتیں فراہم کرنے سے قاصر رہ جائیں اور ہم خود ان کا بندوبست کریں تو یہ بات ان حاکموں کے نااہل ہونے کی تو واضح دلیل ہوگی، مگر ان کی حکومت کے خاتمے اور اس کے مقابل میں دوسری حکومت کو کھڑا کر دینے کا جواز ہرگز نہ ہوگی، بلکہ اس وقت دو ہی راستے شہریوں کے پاس ہوں گے: وہ اس صورت حال کو جوں کا توں قبول کیے رکھیں یا پھر اس حکومت کو تبدیل کرنے اور اس کی جگہ دوسری حکومت کے قیام کا جو آئینی راستہ ہو، اسے اختیار کرلیں۔ بالکل اسی طرح، اگر مرد اپنی قوامیت کی دونوں بنیادیں کھو بیٹھتا ہے، یعنی اس میں مدافعت اور کسب کی طاقت رہ جاتی ہے اور نہ وہ عملی طور پر بیوی کو نان ونفقہ ہی دیتا ہے تو ایسی صورت حال میں بیوی کے پاس بھی دو ہی راستے رہ جائیں گے: وہ اپنے شوہر کی محبت میں، اور اگر یہ نہ ہو تو اپنی اولاد ہی کی محبت میں، اس معاملے کو اسی طرح چلنے دے۔ یا پھر شوہر کی قوامیت سے نکل جانے اور کسی دوسرے کی قوامیت میں آجانے کا وہ راستہ اختیار کرے جو اسلامی قانون نے اس کے لیے وضع کر رکھا ہے، یعنی وہ شوہر سے طلاق کا تقاضا کرے، اگر وہ

---

8۔ لہٰذا، مدین کے کنویں پر بھیڑ بکریوں کو لے جانے کی مثال سے یہ بات قطعاً ثابت نہیں ہوتی کہ میاں بیوی کی ذمہ داریاں ان کا ماحول اور معاشرہ متعین کرتا ہے۔ اول تو یہ مثال میاں اور بیوی کی نہیں، عورت اور مرد کی ہے۔ دوم، 'وَاَبُوْنَا شَیْخٌ کَبِیْرٌ' کے الفاظ میں اُس ضرورت کا بیان ہو گیا ہے جس کی بنا پر ایسا کر لینا کسی کے نزدیک بھی قابل اعتراض نہیں ہے۔

طلاق نہ دے تو عدالت کے ذریعے سے خلع لے کر کسی اور سے شادی کر لے۔ مگر اس کے پاس یہ تیسرا راستہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس انفاق کی بنا پر اپنی قوامیت کا ڈھنڈورا بھی ضرور پیٹ ہی ڈالے۔

یہاں ایک سوال پیدا ہو سکتا ہے، وہ یہ کہ جس طرح کسی بھی شہری کا یہ حق ہے کہ وہ حکومت سے اختلاف کے بعد خود اپنی حکومت سازی کے لیے کوشش کر سکتا اور اسے حاصل بھی کر سکتا ہے، اسی طرح عورت کا یہ حق کیوں نہیں ہے کہ وہ اپنی قوامیت کے لیے کوئی کوشش کرے اور پھر اسے حاصل بھی کر سکے؟ اس کے جواب میں یاد رہے کہ حکومت کرنے کا حق اور اس کی اہلیت ہم اصول میں ہر شہری کے لیے برابر تسلیم کرتے ہیں، مگر جہاں تک خاندان کی قوامیت کا معاملہ ہے تو اس میں میاں اور بیوی ہرگز برابر نہیں ہیں۔ وہ اس لیے کہ مرد کو قوّام صرف اس کے انفاق کی بنا پر نہیں بنایا گیا کہ جو کوئی خرچ کرے، وہ خود قوام ہو جائے، بلکہ اس کی پہلی وجہ تو مرد کی وہ اہلیت ہے جس کا ذکر 'بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ' میں ہوا اور جو عورت کے بجائے صرف اسی میں پائی جاتی ہے۔ مزید یہ کہ وہ کسبی بھی نہیں کہ عورت محنت کرے اور اسے حاصل کر لے۔ چنانچہ عورت اس معاملے میں مرد کے برابر کسی طرح بھی نہیں ہے کہ اس بنیاد پر اس کی قوامیت کا اِمکان کسی بھی درجے میں مان لیا جا سکے۔[9]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

9 البتہ، یہ عین ممکن ہے کہ کوئی مرد اپنی فطری اہلیت سے بالکل محروم رہ جائے اور اس کی عورت میں یہ سب کچھ بدرجۂ اَتم پایا جاتا ہو۔ لیکن اول تو یہ صورت محض استثنائی ہوگی اور قانون ہمیشہ عموم پر بنا کرتے ہیں۔ دوم اس صورت میں بھی قوامیت عملاً چاہے عورت کے ہاتھ میں آ جائے، مگر قانونی طور پر یہ مرد ہی کے پاس رہے گی۔

محمد حسن الیاس

# جزا کا خدائی قانون

یہ کائنات اختلافات کی رنگا رنگی اور تنوعات کے عجائبات کا نگار خانہ ہے۔اس کا حسن اختلافات کی آویزشوں کا نتیجہ ہے۔اس کا نظم اس افتراق میں جھلکتا معجزہ ہے۔حکمت کی ساری اساس اور دانش کی ساری جستجو کا منتہیٰ اس کے اختلاف میں وحدت کی دریافت اور اس کے افتراق میں یکسانیت کا حصول ہے۔ مادہ کے اس ڈھیر میں اس ذات بے ہمتا کی سب سے بڑی کلید اہل نظر اسی کو قرار دیتے ہیں۔

یہ اختلافات،افتراقات اور تنوع صرف آفاق کا ہی عنوان نہیں، بلکہ انفس انسانی بھی اسی کی رزم گاہ ہے۔ایک انسان کا دوسرے سے چہرہ، رنگ و روپ اور صوت وآہنگ کا ہی اختلاف نہیں، بلکہ ذواق و حالات میں بھی نہایت درجہ کا تفاوت ہے۔اہل مذہب کے لیے ان میں وحدت کی تلاش بھی حکمت الٰہیہ کا سر مخفی ہے۔

مذہب کا بنیادی مقدمہ یہ ہے کہ یہ دنیا اصلاً آزمایش کے اصول پر بنائی گئی ہے اور اس آزمایش کا ظہور اس کی صفت خلاقیت کے تحت ہوا ہے۔لہٰذا یہ تنوع اسی کا مظہر ہے۔ یہاں ہر شخص کو علم و عمل میں پاکیزہ رہنے کا امتحان درپیش ہے،اس میں اس کی کارکردگی کے موافق آخرت میں اسے جزا اور سزا ملے گی جو کہ اصلاً انصاف کے اصول پر بنائی گئی ہے،اس عالم میں کارگردگی کے مطابق وہاں انسان اپنی دنیا آپ بنائے گا اور عمل کے علاوہ وہاں کوئی چیز اثر انداز نہ ہوسکے گی۔

اس مقدمہ کو اگر مان بھی لیا جائے تب بھی اس موقع پر یہ سوال پوری شدت کے ساتھ ہر ذی شعور صادر کرسکتا ہے کہ جس کارگردگی پر آخرت میں انسان نے جزاوسزا پانی ہے،اس کے مواقع اس دنیا میں سب کے لیے یکساں نہیں

ہیں۔ آخرت میں تو علم کی بابت سوال ہوگا اور عمل کو بھی جانچا جائے گا، مگر دنیا میں نہ علم کے حصول کے ذرائع یکساں ہیں اور نہ عمل کے مواقع ایک جیسے، اس کی مثالیں ہر جگہ بکھری پڑی ہیں کہ جن کا شمار 'لا یعدو لا یحصی' ہے، اسی سوال کی انتہائی صورت یہ ہے خود اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے بعض کو پیغمبری کے منصب سے سرفراز کرتا ہے۔ مذہبی روایت میں یہ بات طے ہے کہ پیغمبر کا رتبہ بہر کیف بقیہ انسانیت سے بالا ہے۔

اس سوال کے جو جوابات دیے جاتے ہیں، اس تحریر میں انھی کی تنقیح مقصود ہے۔

پہلا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ بے شک انسانوں کے لیے کارکردگی کے مواقع مختلف ہیں، مگر اصول یہ ہے کہ جس کی آزمایش سخت ہے، اس کا انعام بھی زیادہ اور جس کی آزمایش کم ہے اس کی جزا بھی کم۔ اس کی سادہ مثال یہ ہے کہ پیغمبر کی موجودگی کی وجہ سے اس کے نہ ماننے کی سزا سخت، تو ماننے کی وجہ سے مرتبہ بھی صحابی کا۔ رہا یہ سوال کہ دیگر زمانے کے لوگوں کو یہ موقع کیوں نہیں فراہم کیا کہ وہ بڑے انعام کے حصول کے لیے بڑا خطرہ مول لیتے؟ تو اس کا جواب یہ دیا گیا کہ دنیا میں مواقع کی تقسیم اور پھر اس حساب سے جزا اور سزا کا حصول انسان کا خود اختیار کردہ ہے، لہٰذا انسان کو اس پر اعتراض کا حق نہیں۔ انسانوں نے خود اپنے لیے یہ امتحان کے اختلافات تجویز کیے ہیں اور یہ بات قرآن اس طرح واضح کرتا ہے کہ، نہ صرف انسان نے خود آگے بڑھ کر اس امانت کا بوجھ اٹھایا، بلکہ یہ بھی بیان کرتا ہے کہ ہر انسان اس وقت انفرادی طور پر موجود تھا، اس لیے بظاہر اس بات میں کوئی مانع نہیں کہ ہر انسان کو یہ اختیار بھی دیا جاتا کہ وہ آزمایش کا درجہ بھی خود چن لے۔

ہمارے نزدیک یہ جوابات قابل تسلی نہیں ہیں۔

جہاں تک عقلی تشفی کا سوال ہے تو ایک ایسے واقعہ کے بارے میں جو انسانوں کو یاد نہیں یہ الزام دینا کہ تمھیں قیامت میں جزا فلاں سے کم ملے گی، اس لیے کہ تم نے خود ہی یہ پیکج قبول کیا۔ کم از کم عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ انسانوں کے لیے قیامت کی سب سے بڑی کشش ہی یہی ہے کہ وہاں حسب آرزو پا سکے گا، یہی چیز اس کے حوصلوں کو مہمیز دیتی ہے، وہ عقبات طے کرتا ہے اور نیکی کی بازیاں لڑتا ہے، جبکہ انسان کے فطرت شناس جانتے ہیں کہ صرف سزا کی کمی کے سہارے بڑے درجات سے دست برداری عالی حوصلہ لوگوں کے لیے معرکہ سے پہلے ہی شکست کا اعلان ہے:

تم کہتے ہو کہ وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم

قرآن مجید میں سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۷۲ اور سورۂ احزاب (۳۳) کی آیت ۷۲ میں آیا کوئی حسی واقعہ مراد

ہے یا یہ کوئی تمثیل ہے۔اس سے قطع نظر یہ آیت تو اپنے سادہ ترجمہ سے واضح کر رہی ہے کہ فیصلہ سب انسانوں نے یکساں طور پر کیا ہے نہ کہ ہر ایک نے اپنے لیے جداگانہ راہ کا انتخاب کیا ہے، بلکہ ان آیتوں سے اسی مدعا کا ثبوت مقصود ہے کہ رنگ ونسل اور زمان ومکان کے اختلاف کے باوجود انسانوں کا جس بات میں امتحان مقصود ہے، وہ سب کے لیے یکساں طور پر میسر ہے۔مزید برآں سورۂ اعراف (۷) کی آیت ۱۷۳ پڑھی جائے:

اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَآ اَشْرَکَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَکُنَّا ذُرِّیَّۃً مِّنْ بَعْدِھِمْ اَفَتُھْلِکُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ.

یہاں اسی اعتراض کا جواب پیش نظر ہے کہ بعض لوگ یہ کہیں گے کہ ہم تو بعد کے زمانہ میں آئے۔اس لیے ہمیں وہ ذرائع ہدایت میسر نہ تھے جو بعض دوسروں کو تھے تو گویا یہ آیت خود قطعی شہادت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے سب سے امتحان برابری کی سطح پر لینا ہے۔

اور دوسرا جواب جو قابل فہم ہے، وہ یہ ہے کہ امتحان اپنی صورت کے لحاظ سے تو یقیناً سب سے مختلف ہے، مگر نسبت/ تناسب/ فیصد کے اعتبار سے نتیجہ کا رسب سے برابر ہے، یعنی جس کے لیے بظاہر ذرائع ہدایت زیادہ آسانی سے میسر ہیں، اس کے لیے دیگر مشکلات، سخت تر ہو گئی ہیں۔دیکھیے اہل پاکستان کے لیے بظاہر فہم دین کے ذرائع اتنے زیادہ ہیں، مگر اظہار حق کی راہ محدود۔اہل یورپ کے لیے فہم کی مشکلات ہیں، مگر اظہار حق 'ھنیئًا مریئًا' ہے۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

تو یوں کہیے کہ یہ جو دنیا میں آخرت کے امیدواروں کو مختلف پرچے دیے گئے ہیں، اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ وہ الگ الگ پوسٹ کے امیدوار تھے تبھی سب کو الگ الگ پرچہ دیا گیا ہے، بلکہ پوسٹ سب کی ایک ہے۔پرچہ سب کو اس کے علم کی بنیاد پر دیا گیا ہے۔جتنا علم اتنا تفصیلی پرچہ۔جتنا کم علم اتنے آسان سوالات۔اس طرح دونوں کی آسانیاں اور مشکلات برابر ہیں اور جس کے اپنے حساب سے نمبر آئیں گے، انعام میں وہ برابر ہوگا۔

لہٰذا پیدایشی مسلمان خوش نہ ہوں، ان کے لیے بھی جہاں اور جتنا حق واضح ہوا ہے کہ اس کو ماننے کی ذمہ داری باقی ہے، آج ہی کے کچھ بدبخت روز قیامت ابوجہل کے ساتھ ہوں اور بعض خوش نصیب انبیا کی معیت میں ہوں گے۔

یہ جواب اگر عقل کی میزان میں وزن رکھتا ہے تو پھر بتانا ہوگا، خود خدا کی آخری کتاب میں اس کا فیصلہ کیا ہے۔ہر زمانہ کے لیے امتحان اپنی حقیقت میں اور انعام اپنے انجام کے لحاظ سے یکساں ہیں یا زمان ومکان کی تبدیلی کے باعث انعام مختلف ہوگا (سزا اسی کا عقلی لازمہ ہے)۔دیکھیے سورۂ نساء (۴) کی آیت ۶۹ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ جو کوئی جس زمانہ میں اللہ کی اطاعت اور رسول کی اطاعت کا معیار پورا کرے گا، وہ اپنے عمل کے لحاظ سے انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین کے ساتھ ہوگا۔یہ معیت انعام کی یکسانیت کے لیے قول فیصل ہے۔اور اگلی ہی آیت میں

یہ ارشاد ’ذٰلِکَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰہِ‘ کو اگر اس اعتراض کی روشنی میں ملاحظہ کیا جائے تو عجب دل نواز تسلی معلوم ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر زمانہ کے لوگوں کے لیے اپنے فضل سے معیت کا یہ انعام دیا ہے۔

اسی طرح سورۂ توبہ (۹) کی آیت ۱۰۰ میں کہ السابقون الاولون کے ذکر کے بعد متبعین کا تذکرہ کیا گیا اور سب کو بشارت اور ایک ہی نوید سنائی گئی ہے کہ ’رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ وَاَعَدَّ لَھُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ تَحْتَھَا الْاَنْھٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْھَآ اَبَدًا‘۔

اس کے علاوہ سورۂ واقعہ میں تو اللہ تعالیٰ نے دوٹوک انداز میں یہ فیصلہ فرما دیا ہے کہ بلند درجات ہر عہد میں ہر ایک کو دعوت مبارزت دیتے ہیں۔ ’وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ اُولٰٓئِکَ الْمُقَرَّبُوْنَ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ثُلَّۃٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ‘ (۵۶: ۱۰-۱۴)

اس کے بعد اس سوال کا آخری، مگر نازک پہلو باقی رہ گیا کہ بہرکیف نبی کا مرتبہ، عام انسانوں کے لیے اس کا حصول ممکن نہیں ہے۔ یقیناً نہیں، ایسے ہی جیسے کسی بے وزن کے لیے شاعر بننا ممکن نہیں۔ لیکن اس سلسلے میں عقل انسانی تدقیق سے کام لے تو یہاں دو چیزیں ہیں: ایک احترام اور دوسرا انعام۔ احترام تو دوسرے کے لیے فطرت کا خوب صورت احساس ہے، اس کو بجا لانے سے انسان میں محرومی کا احساس نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو خود احترام کرنے والے میں مسرت کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

احترام کسی کارہاے نمایاں کے بغیر بھی انسان کر لیتا ہے، مگر کیا انعام بھی انسان اس کے بغیر برداشت کر سکتا ہے۔ اس کا جواب نفی میں ہے۔ انعام میں بنیاد صرف کارکردگی ہو سکتی ہے۔ اس کو سادہ مثال سے سمجھیں، ایک استاد اور شاگرد کے رشتہ میں شاگرد بہرکیف احترام اور ادب کے لحاظ سے استاد سے کم ہے، اس کو کوئی انسان نہ انصافی بھی نہیں کہہ سکتا۔ لیکن کیا شاگرد اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کر کے بھی استاد کے برابر نہیں ہو سکتا؟ یہ ماننا ناانصافی ہے۔ جس کا آں سوے افلاک اس روز عدل صدور ممکن نہیں۔

امین احسن اصلاحی

# جزا و سزا اتمام حجت کے ساتھ ہے

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

سوال: تاریخ کی گواہی ہے کہ زمانہ میں مشرکین و کفار کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اگر قیامت کا واقع ہونا تسلیم کر لیا جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا رحیم و کریم ذات خداوندی نے دوزخ ہی کو بھرنے کا پلان بنایا ہوا ہے؟

جواب: دنیا میں کفار و مشرکین اور خدا کے باغیوں اور نافرمانوں کی جو کثرت ہے، اس کو دیکھ کر ذہن میں یہ الجھن تو ضرور پیدا ہوتی ہے کہ اگر یہ ساری خلقت جہنم ہی میں جانے والی ہے تو اس دنیا کے پیدا کرنے کا مقصود تو دراصل دوزخ ہی کو بھرنا ٹھہرا، پھر جو خالق ایک ایسی دنیا بنا ڈالے جس کا انجام اتنا ہولناک ہونے والا ہے، اس کو رحیم و کریم کس طرح قرار دیا جا سکتا ہے؟ یا تو وہ رحیم و کریم نہیں ہے یا پھر جزا و سزا کا عقیدہ غلط ہے۔

ایک عام آدمی جب اس سوال پر غور کرتا ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ یا تو وہ خدا کے رحیم و کریم ہونے کے بارے میں متردد ہو جاتا ہے یا پھر جزا و سزا کے عقیدہ میں۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا کے رحیم و کریم ہونے یا جزا و سزا کے باب میں متردد ہو جانے سے اصل سوال حل نہیں ہو جاتا۔ ہوتا جو کچھ ہے، وہ صرف یہ ہے کہ اصلی سوال چند دوسرے پیچیدہ تر سوالات سے بدل جاتا ہے۔ فرض کر لیجیے کہ اس دنیا کا خالق رحیم و کریم نہیں ہے، بلکہ ایک ظالم اور ستم گر ہے یا اس دنیا کے پیچھے جزا و سزا کا کوئی معاملہ نہیں ہے، یہ یوں ہی چلی آ رہی ہے اور یوں چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی تو کیا اس سے وہ سوال حل ہو جاتا ہے جو آپ کے ذہن میں پیدا ہوا ہے؟

اگر اس دنیا کے پیچھے جزا و سزا نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اس کے خالق کی نگاہ میں بدکار و نیکوکار، ظالم اور

منصف، مصلح اور مفسد دونوں برابر ہیں۔ اس کو اس چیز سے کوئی بحث نہیں کہ کس نے اس دنیا میں آکر نیکی اور بھلائی کی زندگی بسر کرنے کی کوشش کی اور کس نے یہاں فساد مچایا۔ غور کیجیے کہ کیا اس نتیجہ پر آپ کی فطرت، آپ کی عقل اور آپ کے دل مطمئن ہوتے ہیں؟ ظاہر ہے کہ نہیں، کیونکہ اس کائنات کے خالق کو ظلم ہی کی تہمت سے بچانے کے لیے تو آپ اوپر کے سوال میں جزا و سزا کے بارے میں متردد ہوئے ہیں۔ اگر جزا و سزا کو نہ مانیے تو اس نہ ماننے سے بھی اس کائنات کے خالق پر ظلم کی تہمت عائد ہوتی ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ دنیا ایک رحیم و کریم خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا نہیں رہ جاتی، بلکہ نعوذ باللہ ایک بدمست کھلنڈرے کا ایک کھیل بن کے رہ جاتی ہے جو روم کے بادشاہوں کی طرح اس کائنات کے تھیٹر میں بھوکے شیروں اور بے بس غلاموں کی کشتی کا تماشا دیکھ رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اس سوال پر غور کرتے وقت لوگ کفر و شرک اور ظلم و معصیت کی کثرت اور لوگوں کے اندر ان کے ارتکاب کی سرگرمیوں پر تو نگاہ ڈالتے ہیں، لیکن اس کائنات کے خالق نے ان چیزوں کے خلاف انسان کے باطن، انسان کے ظاہر، انسان کے علوم، انسانیت کی تاریخ، انسان کے نیچے پھیلی ہوئی زمین اور اس کے اوپر پھیلے ہوئے آسمان کے اندر جو ان گنت اور بے شمار حجتیں پھیلا دی ہیں، ان پر نظر نہیں ڈالتے۔ اگر ان پر بھی نظر ڈالیں تو تعجب اس بات پر نہیں ہوگا کہ خدا نے کفار و مشرکین سے یہ بھری ہوئی دنیا کیوں بنا ڈالی، بلکہ تعجب اور سخت تعجب اس بات پر ہوگا کہ کفر و شرک اور ظلم و معصیت کے خلاف اتنے عظیم اور اتنے بے شمار دلائل و براہین کے ہوتے ہوئے آخر انسان کفر و معصیت کی زندگی پر اس طرح کیوں ٹوٹا پڑ رہا ہے؟

یہ حقیقت بھی اچھی طرح واضح رہے کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے سمع و بصر اور عقل و فکر کی جو صلاحیتیں دی ہیں، وہ خدا کی ان حجتوں کو سمجھنے کے لیے بالکل کافی ہیں اور پرسش اور جزا و سزا جو کچھ ہوگی، انھی سے اور انھی کے لیے ہوگی جو ان صلاحیتوں سے بہرہ مند کیے گئے ہیں۔ جو لوگ ان صلاحیتوں سے محروم رکھے گئے ہیں، وہ ہر قسم کی پرسش سے بھی بری الذمہ قرار دیے گئے ہیں۔ اسی طرح جن کو یہ صلاحیتیں کم ملی ہیں، ان سے پرسش اور مواخذہ بھی ان کی صلاحیتوں ہی کے لحاظ سے ہوگا، ذرہ برابر بھی ان کی صلاحیتوں سے زیادہ نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں ایک سے زیادہ مقامات میں اس بات کی تصریح موجود ہے کہ جو لوگ دوزخ میں ڈالے جائیں گے، وہ خود اس بات کا اقرار کریں گے کہ انھیں جو سزا ملی ہے، وہ اس کے حق دار تھے۔ انھوں نے اپنے آنکھ، کان، دل اور دماغ سے کام نہیں لیا، خدا کی نشانیوں، اس کے نبیوں کی باتوں اور اس کی کتابوں کی حکمتوں کی کوئی پروا نہیں کی، اس وجہ سے اس انجام کو پہنچے۔ اگر وہ سننے سمجھنے والے لوگ ہوتے، اپنی عقل اور سمجھ اور سمع و بصر سے کام لیتے تو اس

دوزخ میں نہ پڑتے: 'وَقَالُوا لَوۡ كُنَّا نَسۡمَعُ اَوۡ نَعۡقِلُ مَا كُنَّا فِیۡۤ اَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ، فَاعۡتَرَفُوۡا بِذَنۡۢبِهِمۡ فَسُحۡقًا لِّاَصۡحٰبِ السَّعِیۡرِ*' (اور کہیں گے کہ اگر ہم بات سننے والے یا سمجھنے والے ہوتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے پس وہ اپنے جرم کا اقرار کریں گے تو دفع ہوں یہ دوزخی)۔

اس آیت سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ دوزخ میں صرف وہی لوگ جائیں گے جن پر حجت تمام ہو چکی ہوگی اور اس حجت کے تمام ہونے کی شہادت دوسرے ان کے خلاف نہیں دیں گے، بلکہ وہ خود دیں گے۔ وہ خود ہی اس امر کا اعتراف کریں گے کہ انھوں نے خود اپنی نالائقیوں سے اپنی یہ شامت بلائی ہے، اس میں کسی دوسرے کا کوئی قصور نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رکھنے کی ہے کہ ہم آپ اس دنیا میں یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ کن لوگوں پر خدا کی حجت تمام ہے اور کن پر تمام نہیں ہے۔ یہ فیصلہ صرف خداے عالم الغیب ہی آخرت میں کرے گا۔ جہاں وہ ہر شخص کے سمع، بصر، فواد اور عقل سے یہ شہادت دلوا دے گا کہ کس نے خدا کی کیا کیا نافرمانیاں اپنی عقل و فطرت سے بغاوت کر کے محض نفس کی پرستش میں کی ہیں اور کون کون سی غلطیاں جہالت اور بے خبری کے عالم میں کی ہیں۔ جس انسان کو اللہ تعالیٰ نے چاند اور مریخ تک پرواز کرنے کی صلاحیتیں دی ہیں، وہ اچھی طرح جانتا ہے کہ اس انسان کے اندر خود خدا تک پہنچنے کے لیے کیا کیا صلاحیتیں ودیعت ہیں، اس وجہ سے اسے حق ہے کہ وہ اس انسان سے پوچھے کہ تمھیں یہ چاند کے چھپے ہوئے دھبے تو نظر آ گئے، لیکن خدا جو تل کے اوٹ میں پہاڑ کی طرح چھپا ہوا تھا، وہ تمھیں نظر نہیں آیا۔

اسی طرح جو لوگ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم، توریت اور انجیل کے ماننے کے مدعی ہیں، اپنی تقریروں اور تحریروں میں ان کے محامد بیان کرتے پھرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ایک طرف ان کے کارناموں کے رجسٹر ان کے آگے کھول کر رکھ دے گا اور دوسری طرف توریت، انجیل اور قرآن کو کھول کر رکھ دے گا اور پھر پوچھے گا کہ کیا موسیٰ علیہ السلام اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تمھیں انھی باتوں کی تعلیم دی تھی؟

بہرحال خدا کے ہاں جو جزا و سزا بھی ہوگی پوری طرح حجت تمام کرنے کے بعد ہی ہوگی۔ یہاں تک کہ ہر مجرم خود پکار اٹھے گا کہ اسے جو سزا ملی ہے بالکل انصاف کے ساتھ ملی ہے۔

اب اس اتمام حجت کے بعد بھی اور اس فطرت سے نوازے جانے کے علی الرغم جس کا ذکر پہلے سوال کے جواب کے سلسلہ میں آ چکا ہے، اگر انسانوں کی اکثریت دوزخ ہی میں گرے تو اس کا الزام انسان ہی پر ہے نہ کہ کائنات کے خالق پر۔ وہ ابدی زندگی کی خوشیاں حاصل کرنے کا زیادہ سے زیادہ لوگوں کو موقع دے رہا ہے اور جو زیادہ سے

---

* الملک ۶۷: ۱۰-۱۱۔

زیادہ الاؤنس ہر ایک کو مختلف حالات کے تحت ملنا چاہیے، وہ بھی مہیا کر رہا ہے۔ اب ان سب باتوں کے باوجود بھی لوگ اگر اس ابدی فوز وفلاح کا راستہ نہ اختیار کریں تو اس میں کس کا قصور ہے۔

اس بات کا زیادہ خیال نہ کیجیے کہ پھوک زیادہ نکل رہا ہے جو ہر کم۔ جو خالق کائنات اس دنیا کو بلو رہا ہے، وہی جانتا ہے کہ اس دودھ سے کچھ مکھن نکل رہا ہے یا نہیں اور اگر نکل رہا ہے تو کتنا۔ بہر حال جب تک اس کے بلونے کا سلسلہ جاری ہے، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ اس سے مکھن نکل رہا ہے۔ اگر اس مکھن کا نکلنا بند ہو جائے گا تو اس کے بلونے کا سلسلہ بھی بند ہو جائے گا۔ پھر قیامت آ جائے گی۔

پھر اس حقیقت کو بھی یاد رکھیے کہ جس کارخانہ میں جتنا ہی زیادہ قیمتی سامان تیار ہوتا ہے، اتنا ہی زیادہ اس کے لیے خام مواد بھی مطلوب ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے اس پر خرچ بھی اٹھتا ہے۔ اپنے اس زمانہ میں ایٹم بم کے کارخانوں ہی کو دیکھ لیجیے۔ پھر جس کارخانے میں صدیقین، شہداء اور ابرار و صالحین تیار ہو رہے ہیں کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کارخانے کے لوازم کیا کچھ ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

امین احسن اصلاحی

# مولانا حفظ الرحمان سیوہاروی

اخبارات سے یہ معلوم کر کے بڑا صدمہ ہوا کہ جمعیت علماے ہند کے ناظم، مولانا حفظ الرحمان صاحب سیوہاروی کا انتقال ہو گیا۔ یہ حادثہ مسلمانوں کی پوری قوم کے لیے ایک بڑا اہم حادثہ ہے۔ جو لوگ آج پاکستان کے گوشۂ امن و عافیت میں پہنچ کر بھارت کے اپنے چھ کروڑ مسلمان بھائیوں کو دلوں سے نکال بیٹھے ہیں، وہ تو اس حادثے کی اہمیت کا کماحقہٗ اندازہ نہیں کر سکیں گے، لیکن جو لوگ بھارت کے مسلمانوں کو بھولے نہیں ہیں اور انھیں اس مظلومیت کا بھی اندازہ ہے جس میں اس وقت ہمارے یہ بھائی مبتلا ہیں، وہ کچھ اندازہ کر سکیں گے کہ مولانا مرحوم کی ذات ان کے لیے، ان کے اس دور ابتلا میں، کتنا بڑا سہارا تھی۔ وہ فی الواقع ایک نڈر اور بہادر مسلمان تھے۔ انھوں نے تقسیم ملک کے بعد کے خطرناک حالات کا نہایت دانش مندی، نہایت بردباری، نہایت صبر و استقلال اور نہایت عزم و حوصلہ کے ساتھ مقابلہ کیا اور اپنی قوم کا حوصلہ قائم رکھنے کے لیے جان کی بازی لگا دی۔ میرا ذاتی تاثر تو یہ ہے کہ قیام پاکستان کے بعد بھارت کے مسلمانوں کی خدمت کی جو توفیق انھیں میسر آئی، اس میں کوئی دوسرا مشکل ہی سے ان کے برابر ہو سکے گا۔ انھوں نے ملک کی مشترک جدوجہد آزادی میں جو نمایاں خدمات انجام دی تھیں، اس کی وجہ سے کانگریسی حلقوں پر ان کا خاصا اچھا اثر تھا۔ انھوں نے اپنے اس پورے اثر کو بالکل بے لوث اور بالکل بے خوف ہو کر اپنی قوم کی حمایت و مدافعت میں صرف کیا۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی خدمت کو قبول فرمائے، پوری قوم کی طرف سے ان کو جزاے خیر دے اور بھارت کے مسلمانوں کو ان کا نعم البدل عطا فرمائے! ایک زمانہ میں مولانا مرحوم کے ساتھ راقم کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ اب یہ تعلقات تو دوری کے سبب سے ختم ہو چکے تھے، لیکن اس دور میں مسلمانوں کی جو

خدمت وہ کررہے تھے، اس کے سبب سے ان کی محبت اور ان کی قدر و عزت دل میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی تھی۔ اللہ تعالیٰ مولانا کی مغفرت فرمائے! اب یہ دعاے مغفرت ہی واحد سوغات ہے جو اس مجاہد ملت کے لیے اتنی دور سے ہم بھیج سکتے ہیں۔ہم ''میثاق'' کے تمام قارئین سے بھی مولانا مرحوم کے لیے دعاے مغفرت کی درخواست کرتے ہیں۔

(ماہنامہ میثاق لاہور - اگست ۱۹۶۲ء)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org